اور طریقہ بحث واستدلال موثر ہے مصنف نے اختصار کے باوجود اہم مطالب کی بقدر ضرورت توضیح وتشریح کی ہے اور آیتوں کی باہمی مناسبت، سورتوں کے عمود ونظام اور ان کے مضامین کا تجزیہ بھی کیا ہے ایک حد تک احادیث اور بائبل کے حوالے بھی دیئے ہیں، اور کسی خاص نقطہ نظر کی جا وبیجا حمایت کے بجائے قرآن کے اصل مقصد کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے اس لئے اس میں جدید تعلیم یافتہ اشخاص اور غیر مسلموں کے ذوق وتشفی کا سامان ہے مصنف نے اس میں جا بجا نقشے بھی دیے ہیں اور آخر میں ایک مفصل اشاریہ بھی ہے، مگر کہیں کہیں ترجمہ ترجمانی کی حد میں آگیا ہے، بعض جگہ ترجمہ میں حشو زوائد بھی ہیں جیسے وَلَاهُمْ يُنْصَرُونَ کا "اور نہ وہ کہیں سے مدد ہی پا سکیں گے"، خط کشیدہ الفاظ زائد ہیں اگر یہ مترجم کے نزدیک ناگزیر تھے تو ان کو قوسین میں دینا چاہئے تھا، نیز صیغہ مجہول کا ترجمہ بلا ضرورت صیغہ معروف سے کرنا بھی خلاف احتیاط ہے، اسی طرح عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ کا ترجمہ سلیمان کی حکومت کی طرف منسوب کرکے نہ صرف زائد بلکہ غلط ہے۔ "سلیمان کے عہد حکومت میں" کافی تھا، بعض آیتوں کے ترجمہ سے مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو سکا ہے، حواشی میں اس کی وضاحت ضروری تھی جو نہیں کی گئی ہے۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ۔ "مگر جو بات کہی گئی تھی اسے ظالموں نے دوسری بات سے بدل دیا" ظاہر ہے یہ دوسری بات توضیح طلب تھی، ترجمہ میں گو عربی جملوں کی ترتیب کا ہر جگہ بعینہ لحاظ ممکن نہیں ہوتا، مگر قرآن کے ترجمہ میں جس قدر ممکن ہو اس کی پابندی کرنی چاہئے لیکن لائق مترجم نے بامحاورہ ترجمہ کے شوق میں اس کا اکثر لحاظ نہیں کیا ہے، مصنف نے بعض آیتوں کا جو مفہوم بیان کیا ہے ان کے دوسرے مفہوم کا احتمال بھی ہے، اور وہ بہت زیادہ نامناسب بھی نہیں ہے، اس لئے اسکا ذکر بھی کرنا چاہئے تھا۔

"ض"

جلد ۱۳۰ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۲ء عدد ۳

مضامین

دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ — DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

شذرات

مغربی بیروت پر یہودیوں کی وحشیانہ بمباری کے بعد فلسطینیوں کو جس طرح پھر ایک بار بے گھر ہونا پڑا، اس سے متاثر ہو کر قلم صد ہزار نمکدان لے کر پھر جراحتِ دل کی پرسش کرنے چلا ہے،

یہودی خوش ہوں گے کہ ۱۹۶۷ء کی طرح عربوں یعنی مسلمانوں پر ان کو ایک اور فتح ہوئی، مگر بیروت میں انھوں نے جو سفاکی دکھائی، اس سے ان کے خلاف بڑی بین الاقوامی نفرت پیدا ہو گئی ہے، لیکن وہ دنیا کی نفرت کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب کوئی نفرت ان کے لئے باعثِ ندامت نہیں، فلسطینیوں کو بظاہر شکست ہوئی لیکن پوری دنیا کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے، اسرائیلیوں کا تنہا لیکن بہت بڑا حلیف امریکہ ہے، اور یہ جنگ اسرائیل کیا لڑ سکتا تھا، امریکہ ہی لڑ رہا تھا، وہ بھی یہودیوں کی بربریت سے چیخ اٹھا، اور اس کی طرف سے یہ اعلان ہوا ہے کہ فلسطینیوں کو ایک وطن ملنا ضروری ہے، جو اسرائیل کے پڑوس میں اردن سے ملحق غازہ کی پٹی میں ہونا چاہئے، اسرائیل پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا، اس کی ساری خوشی زائل ہو گئی، اس کو امریکہ کی یہ تجویز منظور نہیں لیکن پھر کب امریکہ کی اس داشتہ کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ اس کی اپنی خواہش کوئی خواہش نہیں،

مسلمان اپنی گذشتہ تاریخ میں اب تک صرف عیسائیوں ہی سے برابر برسرِ پیکار رہے، بنو عباس نے رومن امپائر کے حکمرانوں کے خلاف لڑ کر ان سے جزیہ بھی وصول کیا، صلیبی جنگ میں عیسائیوں کی متحدہ قوت سے نبرد آزما ہو کر ان کو زیر کیا، عثمانی فرمانرواؤں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے رومن امپائر کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی، اور وہ ایک مدت تک یورپ کے جنگی محاذوں پر غالب رہے، مگر ایسا بھی زمانہ آیا کہ دولِ یورپ نے مل کر پہلی جنگ عظیم میں دولتِ عثمانی کو جو ٹرکش امپائر

کہلاتی تھی، ختم کیا، اور اس کے حصے بخرے کر کے مشرق وسطیٰ پر اپنی عیارانہ سامراجیت کا پرچم لہرا دیا، لیکن بیسویں صدی میں کسی ملک کو غلامی کا طوق پہنائے رکھنا آسان نہیں ہو سکا، اسلامی ممالک آزاد ہو کر ایک بڑی طاقت بن کر ابھر رہے تھے کہ عیسائیوں نے یہودیوں کو اپنا آلۂ کار بنا کر ان کی نشاۃ ثانیہ پر کاری ضرب لگانے کی مہم شروع کر دی،

ممکن ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی مشترکہ سازش کی کامیابیوں سے عربوں اور مسلمانوں میں مایوسی بددلی اور پست ہمتی پیدا ہو اور وہ اپنا مستقبل تاریک دیکھنے لگیں، یہ صحیح ہے کہ عیسائیوں ہی کی ریشہ دوانیوں سے انھوں نے صقلیہ، اندلس، اور ٹرکش امپائر (ایشیا) کی اور دوسری حکومتیں کھوئیں مگر ان کی تاریخ یہ بھی رہی ہے کہ احد اور حنین کے بعد غیر معمولی طاقت بن کر ابھرے، جمل اور صفین کی لڑائیاں لڑنے کے باوجود دنیا ان کے قدموں سے آ لگی، کربلا کی خون آشامیوں کے بعد بنو امیہ کا دائرۂ حکومت اتنا بڑھا کہ آج تک اس پر فخر کیا جاتا ہے، بنو امیہ کا سقوط بڑی بے دردی کے ساتھ کیا گیا، لیکن اسی کے بعد بنو عباس کے کارناموں میں الف لیلہ کی داستان کا رنگ پیدا ہو گیا، خود عباسیوں کا خاتمہ تاتاریوں نے جس بے رحمی سے کیا، وہ دنیا کا ہولناک ترین المیہ ہے لیکن اسی کے بعد دولت عثمانیہ کا عروج دیکھ کر دنیا متحیر تھی، خود دولتِ عثمانیہ کا خاتمہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک دوسرا زبردست المیہ ہے لیکن اسی کی خاک سے اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی بیالیس حکومتیں قائم ہیں، جو اگر صحیح معنوں میں متحد رہیں، تو وہ دنیا کے سیاسی توازن کو اپنے قابو میں کر لیں،

حکومتوں کا شکست و ریخت ہونا تاریخ کے لئے کوئی نئی چیز نہیں، یہ لازمی طور پر پیش آتی ہے، بخت نصر، سکندر، سیزر، ہنیبال، بسمارک، نپولین، ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کے کارنامے بس زیبِ داستان بن کر رہ گئے ہیں، بابل، نینوا، رومن امپائر، ٹرکش امپائر اور برطانوی امپائر کی تاریخ مورخ کے سینوں اور سفینوں میں بند ہو کر رہ گئی ہے، ابھرنا، ڈوبنا، ڈوب کر ساحل سے آلگنا، جھپٹنا، پلٹنا، اور پلٹ کر جھپٹنا زندہ قوموں کی تاریخ رہی ہے، ان کی شکست کبھی فتح، اور ان کی فتح کبھی شکست بن جاتی ہے،

یہ فیصلہ کرنا ابھی قبل از وقت ہے کہ جھوٹ باتوں کے سننے والے، مالِ حرام کے کھانے والے گناہ اور تعدی کی طرف تیزی سے بڑھنے والے یہودی (مائدہ ۶، نساء ۴۴) مشرق وسطیٰ کی لڑائیوں میں کامیاب رہے ہیں، یا وہ ساری دنیا سے کٹ کر

اسرائیل کے لفافہ میں اس لئے بند ہو رہے ہیں کہ وہ اپنی تباہی اور بربادی کے اسباب فراہم کریں، عربوں کو اس وقت شکست ضرور ہوئی ہے، مگر کلام پاک میں اُن کو ہدایت دی گئی ہے کہ اہل کتاب اور مشرکوں سے تم ایذا کی باتیں سنوگے، اور اگر صبر کئے رہو اور پرہیزگاری پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں، (آل عمران ع ۱۹)

یہودیوں اور عربوں یعنی مسلمانوں کے تصادم کی نوعیت یہ ہے کہ ایک اپنی ازلی نکبت کو دور کرنے کی فکر میں ہے، دوسرا اپنی دیرینہ عظمت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے، ایک کو امریکی اسلحہ اور اپنی خباثت پر بھروسہ ہے، دوسرے کو خیر الامت ہونے کی بشارت اور اپنی ایمانی حرارت کا سہارا ہے، اس سے قطع نظر فلسطینیوں نے گذشتہ بیس برس سے اپنی متحرک زندگی کا جو ثبوت دیا ہے، وہی اُن کے زندہ رہنے کی اصلی ضمانت ہے، انھوں نے بیروت کی بمباری کے موقع پر جس پامردی اور بے جگری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ رزمیہ نظم کا موضوع بن سکتا ہے، وہ دنیا کی نظروں میں ہیرو بن کر ابھرے ہیں، اور وہ بے خانماں و برباد ہونے کے باوجود جہاں پہونچے اُن کا استقبال بطل حریت ہی کی طرح ہوا، ان کی جانبازی اور سرفروشی کی طرح قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق ان میں پرہیزگاری بھی ہو جائے تو وہ یہودیوں کے شر سے خیر پیدا کرکے مسلمانوں کی تاریخ کا رُخ موڑ سکتے ہیں، اب یہ دلکش پہلو ضرور سامنے آرہا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی شر انگیزیوں سے عربوں میں اتحاد اور یکانگت کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے، عرب لیگ اور اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس اس کا عملی ثبوت ہے،

برطانیہ کے مشہور مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی موت سے بہت پہلے فلسطین کے مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک مورخ کی حیثیت سے مجھے وہ وقت یاد ہے جب صلیبی جنگ نے عربوں اور اسلام کے لئے ایسے ہی عظیم مسائل پیدا کر دیئے تھے جیسا کہ اسرائیل کے قیام سے پیدا ہو گئے ہیں، پہلی صورت میں عربوں کا ردعمل فوری نوعیت کا نہیں تھا مگر انجام کار عرب ایک مضبوط اتحاد قائم کرنے اور خود کو درپیش خطرے کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، مجھے اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ حالات میں بھی عربوں میں اتحاد کی تحریک فروغ پائے گی جیسا کہ آٹھ سو سال پہلے پھیلی تھی، عربوں کے اتحاد و نشاۃ ثانیہ سے دنیا کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بہت کچھ دے سکتے ہیں کیونکہ ان کی تہذیبی روایات انسانیت کے مشترکہ خزانے کا قیمتی سرمایہ ہیں،

ٹوائن بی کی پیشین گوئی کا صحیح ثابت ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوگی،

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خون عرب سے

مقالات

مستشرقین، استشراق اور اسلام

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد

میرے مقالہ کا عنوان ہے "مستشرقین، استشراق اور اسلام" یہ سمینار کے مرکزی موضوع "اسلام اور مستشرقین" سے ذرا ہٹ کر ہے، سمینار کے موضوع کا مطلب جہاں تک میں نے سمجھا، یہ ہے کہ مستشرقین اسلام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اور اسلام کے ساتھ ان کا رویہ کیا ہے، جب کہ میں نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلام مستشرقین کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

سب سے پہلے میں موضوع میں شامل الفاظ کی مختصر لغوی اور معنوی تشریح پیش کرتا ہوں، اس سے آیندہ مباحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مستشرق مشتق ہے استشراق سے، جس کا مادہ شرق ہے، جو ضد متصور ہوتا ہے غرب کا، میں نے "متصور ہوتا ہے" کہا، اس لیے کہ میرے نزدیک یہ تقسیم و تفریق حقیقی نہیں، اعتباری ہے، اور غیر صحت مند رجحانات کی پیداوار ہے، شرق و غرب کے دو باہم متضاد اور اردو میں مستعمل مترادفات مشرق و مغرب ہیں، عربی میں مستشرق ہی نہیں خود اس کا اسم یا مصدر استشراق بھی مولّد یعنی نیا اور بعد کی پیداوار ہے، چنانچہ قدیم عربی لغات میں اس مادہ کا باب استفعال سرے سے

مفقود ہے، جدید لغات میں، یا قدیم لغات کے جدید ایڈیشنوں میں البتہ مستشرق اور استشراق کے الفاظ بطور اسم فاعل اور اسم مصدر کے ملتے ہیں، جن کا استعمال مخصوص بھی ہے اور محدود بھی، استشرق بطور فعل کے ان لغات میں بھی مذکور نہیں ہے، عربی یا اردو لٹریچر میں بھی یہ لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے اور الفاظ پہلے استعمال میں آتے ہیں، اس کے بعد ہی لغات میں جگہ پاتے ہیں، درحقیقت یہ الفاظ ترجمہ یا چربہ ہیں اورینٹلسٹ اور اورینٹلزم کا، جو اورینٹ سے ماخوذ ہیں، انگریزی میں اورینٹ ایسٹ کا ہم معنی ہے، اہل مغرب نے یہ نام اپنے ان نام نہاد اسکالروں کو دیا جنھوں نے بزعم ان کے مشرقی علوم وفنون، زبان وادب اور تہذیب وثقافت کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے، اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا اور ان کا خصوصی مطالعہ کرکے براہ راست اس سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لیے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا، اس لیے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی ہی کے طرز پر الفاظ وضع کر لیے گئے۔

عربی زبان میں ایک ہی مادہ کو مختلف ابواب میں لے جاکر بذریعۂ اشتقاق طرح طرح کے الفاظ بنانے کا ایک وسیع نظام موجود ہے، بایں طور کہ مادے کا اصل معنی باقی رہتے ہوئے اس میں تنوع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، عربی کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیت جس کو خاصیت ابواب کہتے ہیں، اس باب میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، مثلاً عربی کا ایک باب تفاعل ہے، اس کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ اصل مادہ کے مفہوم کو بناوٹی طور پر اختیار کرنے کا تصور دیتا ہے، م ر ض ایک مادہ ہے، اس کے معنی بیمار ہونے کے ہیں، وہی مادہ باب تفاعل میں جاکر جب تمارض بن جاتا ہے تو اس کا معنی ہو جاتا ہے جھوٹ موٹ کا بیمار بننا، ایک اور مثال لیجیے، شعر سے شاعر بنا تو وہ واقعی شاعر کے لیے استعمال ہوا، لیکن باب تفاعل سے متشاعر بنا تو اس کا مطلب ہوا جھوٹا بناوٹی شاعر، اسی طرح تجاھل کے معنی جان کر انجان بننا۔

ثلاثی مزید کے ابواب میں سے باب استفعال جس کے وزن پر استشراق بنایا گیا ہے، اس کی ایک خاصیت صیرورۃ اور اتخاذ ہے، جس میں بن جانا، اپنانا یا حاصل کرنا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً استحجر الطین مٹی پتھر بن گئی، استوطن القریۃ بستی کو اپنا وطن بنالیا، استفاد کا فائدہ حاصل کرنا۔ اسی اصول اور قاعدہ کے تحت جب کسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے باہر سے آکر جزیرۃ العرب میں بود و باش اختیار کی اور وقت گذرنے کے ساتھ وہ بھی عرب ہوگئے تو ان کو عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں سے ممیز کرنے کے لیے اسی باب استفعال سے کام لے کر ایک لفظ بنایا گیا استعرب، عرب بن گیا، چنانچہ عرب کی قدیم تاریخ میں عرب، عاربہ اور مستعربہ کی اصطلاحیں ملتی ہیں، اردو میں ہم اسے اصلی عرب اور نقلی عرب بھی کہہ سکتے ہیں، نئے اور پرانے، سچے اور جھوٹے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، اس مسئلہ کی میں نے تحقیق نہیں کی کہ عربی میں مستشرقین اور استشراق کا لفظ پہلے پہل کس نے وضع کیا، اس کے واضع خود مستشرقین ہیں یا ان کے غیر، اگر خود مستشرقین ہیں تو ان سے چوک ہوئی، اور اگر غیر ہیں تو ان کا تیر نشانہ پر لگا، استشراق کی حقیقت اور اس کی تاریخ جن کی نظر میں ہے وہ تسلیم کریں گے کہ یہ نام ان کے لیے انتہائی موزوں ہے، خود یہ نام ان کا راز فاش کرتا ہے، ان کے چہرے سے نقاب اٹھا کر ان کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے، حاصل کلام یہ کہ ازروئے عربی زبان استشراق کے معنی ہوئے بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کے معنی وہ شخص جس نے بہ تکلف شرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا، اور ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت کسی مغربی ہی کی طرف ہو سکتی ہے، خود کسی مشرقی کا مشرقی بننا مہمل سی بات ہے۔ لیکن عموماً اہل لغت اس کو ظاہر نہیں کرتے، چنانچہ جب وہ مستشرق کے معنی لکھتے ہیں تو بلا کسی فرق و امتیاز کے علی الاطلاق اس کا ذکر کرتے ہیں، میں نمونۃً ایک معمولی عربی لغت المنجد کا حوالہ دوں گا جو بہت متداول ہے، اس کے قدیم ایڈیشنوں میں تو یہ لفظ موجود ہی نہیں ہے، جدید ایڈیشنوں میں ہے: المستشرق: العالم

باللغات والآداب والعلوم الشرقية، یعنی مشرقی زبانوں، ادبیات اور علوم کا جاننے والا۔
کیا ہم مشرق سے تعلق رکھنے والے ایسے کسی عالم کو مستشرق کہہ سکتے ہیں جو مشرقی علوم والسنہ کا
جاننے والا ہو، اسی طرح کیا ہم کسی ایسے مسلمان کو مستشرق کہہ سکتے ہیں خواہ اس کا تعلق مغرب ہی
سے کیوں نہ ہو؟ ظاہر ہے نہیں کہہ سکتے، معلوم ہوا کہ اصطلاحاً یا عرفاً یہ لفظ مخصوص ہے ان غیر مسلم
علمائے مغرب کے لیے جو مشرقی زبانوں اور علوم وآداب میں دلچسپی لیتے ہوں، خود مشرقی زبانوں
اور علوم وآداب میں بھی تحدید کی ضرورت ہے، مشرق سے تعلق رکھنے والی غیر مسلم زبانوں، غیر اسلامی
علوم وفنون اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے عالم کو بھی مستشرق نہیں کہہ سکتے، چاہے وہ
کوئی غیر مسلم اور مغربی ہی کیوں نہ ہو، سنسکرت، ہندومت اور بدھ مت کے کسی عیسائی مغربی اسکالر
کو کوئی مستشرق نہیں کہتا، تو گویا بات یہاں تک پہونچی کہ مستشرق مغرب کے ان غیر مسلم خاص کر
یہودی اور عیسائی اسکالروں کو کہتے ہیں جو اسلام، اسلامی علوم، اسلامی زبانوں اور اسلامی
تہذیب وثقافت کے مطالعہ میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں، اور میں نے جہاں تک اندازہ لگایا
ہے اس کانفرنس کے مرکزی موضوع میں لفظ مستشرق کا یہی تصور مراد ہے، ورنہ اگر ہم المنجد
کے مذکورۃ الصدر مفہوم کو سامنے رکھیں گے تو اس سے کئی الجھنیں پیدا ہوں گی، میں نے تحقیق
نہیں کی، مگر میرا اندازہ ہے کہ المنجد کا مولف خود مستشرق ہے اور خود اس لفظ کی تعبیر وتاویل میں
بھی اس کے استشراق کی دانستہ یا نادانستہ طور پر کارفرمائی موجود ہے، مدعا کی مزید وضاحت کیلئے
میں لغت ہی سے متعلق استشراق کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا، الفرائد الدریہ کا مصنف
جُنُب کا مفہوم بیان کرتا ہے تو نہ صرف اپنی طرف سے اس میں ذم کا پہلو شامل کر دیتا ہے، بلکہ
زبردستی مسلمانوں کے ساتھ اس کی نسبت قائم کرتا ہے، عربی زبان کے مطابق جنب اس شخص کو
کہتے ہیں جو حالت جنابت میں ہو، یا جسے جنابت لاحق ہو گئی ہو، جنابت ایک ایسی حالت ہے

جس میں فی نفسہ ذم کا کوئی پہلو نہیں، اور یہ حالت مسلم غیر مسلم کسی کو بھی پیش آسکتی ہے، لیکن
الفرائد الدریہ کا پادری مصنف ہاوا جب اس کے معنی لکھتا ہے تو اس کے ساتھ مسلم کا لفظ لگا کر
اپنے استشراق کا مظاہرہ کرتا ہے، ج ن ب کی فصل ملاحظہ ہو:

جنب معنی Polluted Muslim یعنی غلیظ یا پلید مسلمان۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مستشرق کا مطلب بتاتے وقت جہاں لغوی اور اصطلاحی دونوں معنی
سے اس کو مقید کرنے کی ضرورت تھی وہاں تو اس کو مطلق رکھا گیا لیکن جنب کا مطلب بیان کرنے
میں جہاں تقیید وتحدید کی کوئی گنجائش نہیں تھی وہاں کس طرح اپنی طرف سے اقول کا اضافہ
کر دیا گیا، گویا کہ اسلام اور مسلم دشمنی کا دوسرا نام استشراق ہے، اور ہر وہ عالم شخص جو اس رجحان
کا حامل ہو وہ مستشرق ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں، بات مستشرق
اور استشراق کی ہو رہی تھی، جیسا کہ میں نے ابتدائی سطور میں عرض کیا، ان الفاظ کی اصل شرق
یا مشرق ہے جو ضد ہے غرب اور مغرب کا، آپ ذرا غور کیجیے مشرق ومغرب کی تقسیم اور حد بندی
کی حقیقت کیا ہے، یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اس کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اور اس کے
پیچھے کیا محرکات کارفرما ہیں؟ جہاں تک کہ ان کے امر واقعہ ہونے کا تعلق ہے تو یہ کائناتی
صداقتیں ہیں، یہ مظاہر فطرت ہیں، ان کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے، جس سمت سے
سورج طلوع ہوتا ہے اس کو مشرق کہنا اور جس سمت میں غروب ہوتا ہے اس کو مغرب کہنا
ایک قدرتی واقعہ کا اظہار ہے، لیکن اس کی بنیاد پر دنیا کو تقسیم کرنا انسانیت کی ردا کو تار تار
کرنا ہے، یا اقبال کے الفاظ میں یہ تمیز فساد آدمیت ہے، یہ تدلیس ابلیس ہے، یہ فساد قلب
ونظر کا شاخسانہ ہے، اہل ہوس نے ہوائے نفس کی تکمیل کے لیے جو حیلے تراشے ہیں ان میں سے

ایک گمراہ کن حیلہ یہ بھی ہے کہ ایک سازش ہے نقطۂ دین و مروت کے خلاف

اقبال نے جدید و قدیم کی تفریق کو ہدفِ ملامت بنایا

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک — دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

بالکل یہی حال مشرق و مغرب کی تقسیم کے اس افسوں کا ہے جو اہل مغرب نے اپنے غیر انسانی مقاصد کے لیے پھونکا ہے، آپ اپنی دنیا کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالیے، کیا نام نہاد اہل مغرب کے ظہور سے پہلے بھی اس قسم کی تقسیم کا وجود اس تصور کے ساتھ کہیں ملتا ہے جو اہل مغرب نے دنیا کو دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شرق و غرب یا مشرق و مغرب کی تفریق و تقسیم اور ان کے مابین تضاد کا موجودہ تصور بھی دین ہے اہل مغرب ہی کی جس کو انھوں نے اپنے استعماری مقاصد کے لیے عام کیا، ورنہ اسلام کے نقطۂ نظر سے مشرق و مغرب دونوں ایک ہی دریا کے دو کنارے ہیں اور ان میں تفریق و تقسیم کی کوئی بھی واقعی یا حقیقی بنیاد موجود نہیں ہے، قرآن کہتا ہے:

لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ — اللہ ہی کے ہیں مشرق و مغرب،

(بقرہ: ۱۱۵ و ۱۴۲)

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (شعراء ۲۸، مزمل ۹) رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (رحمٰن ۱۷) مشرق و مغرب سب کا خالق مالک پروردگار جب اللہ تعالیٰ ہے تو انسانوں کے ایک گروہ کو یہ کہاں سے حق حاصل ہوگیا کہ وہ دنیا کی بندر بانٹ کر کے اپنا حصہ ہی نہیں کل کا کل ہضم کرنے کے لیے مکر و فن سے کام لیں۔

میں نے مشرق و مغرب کی غیر فطری تقسیم کے لیے بندر بانٹ کا استعارہ استعمال کیا ہے، اس کی بلاغت کا کما حقہ ادراک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس استعارہ میں جو تلمیح ہے اس کو

ذہن میں تازہ کر لیا جائے، دو بلیوں میں کسی شے کی تقسیم پر جھگڑا ہوا، وہ خود جھگڑا طے نہ کر سکیں تو تصفیہ کے لیے ایک بندر کے پاس لے گئیں، بندر چالاک تھا، اس نے اس شے کے دو غیر مساوی حصے کیے اور ان کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ دیا، اس کے بعد جو حصہ زیادہ تھا اس میں سے اتنا نکال کر کھا لیا کہ جو حصہ زیادہ تھا وہ کم اور جو کم تھا وہ زیادہ ہوگیا، یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا، یہاں تک کہ دونوں پلڑے خالی ہوگئے اور بلیوں کے لیے کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہ رہا، ان دانایانِ فرنگ نے اب تک ہماری دنیا کے ساتھ کیا کیا ہے، جب سے ان کو دنیا کے معاملات میں عمل دخل کا موقع ملا ہے، ان کی بندر بانٹ جاری ہے، پہلے انھوں نے دنیا کو مشرق و مغرب میں تقسیم کیا اور حکمت عملی یہ اختیار کی کہ مغرب تو ان کا ہے ہی کہ وہ مغرب کے ہیں اور مغرب ان کا ہے، رہا مشرق تو اس کو انھوں نے طرح طرح کے حربے اور ہتھکنڈے اختیار کر کے اپنے استعماری اور استحصالی عزائم کی آماجگاہ بنا رکھا ہے، ان ہی حربوں اور ہتھکنڈوں میں سے ایک استشراق بھی ہے، یہ مستشرق جنھیں اسکالر کا پُرفریب نام دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت مغربی استعمار کے دو پاؤں میں سے ایک ہے، میں نے ان کے لیے ایجنٹ کا لفظ استعمال نہیں کیا، ایجنٹ دوسروں کا کارندہ اور آلۂ کار ہوتا ہے، یہ کسی کے آلۂ کار نہیں، یہ ان کا اپنا کاروبار ہے، یہ فقط تقسیم کار ہے، ہاں ان کے آلۂ کار بھی ہیں، ان کا ذکر بھی میں کروں گا، ان کے ذکر کے بغیر یہ داستان نامکمل رہ جائے گی۔

مستشرقین کے نام میں بظاہر بڑی معصومیت ہے، اور نام ہی پر کیا موقوف ہے، ان کے کام کو بھی دیکھیں تو بادی النظر میں اس میں برائی کی بات نظر نہیں آئے گی، آخر اس میں برائی کی کیا بات ہے، اگر بے چارے مغربی اسکالر اور مفکرین مشرقی علوم و فنون کی تحصیل و تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وقت ہی نہیں سرمایہ اور ذہنی صلاحیتیں بھی، وہ کام جو ہمیں

کرنا چاہیے" بے چارے وہ کر رہے ہیں، کیا یہ ان کا احسان نہیں ہے اہل مشرق پر؟ سادہ لوح
اہل مشرق سادہ لوح مسلمان ان کا احسان مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کو گلہ بھی ہے ؎

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

اس لیے کہ ؎ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اب میں عنوان کے تیسرے لفظ اسلام کی طرف آتا ہوں۔

اسلام کی دو تعبیریں ہیں، ایک لغوی، دوسری اصطلاحی۔ لغوی تعبیر کی رو سے اسلام
ابتدائے آفرینش سے انسانیت کا آسمانی مذہب رہا ہے، آدم سے لے کر نبی آخر الزماں حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک معلوم نامعلوم، معروف غیر معروف، تمام انبیاء دین اسلام ہی کے حامل
داعی اور نقیب تھے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ　　اللہ کا اصل دین اسلام ہے

(آل عمران: ۹)

نوح، ابراہیم، داؤد و سلیمان، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام سب کا دین اسلام ہی تھا، اس لیے
کہ انھوں نے جس دین کی دعوت دی اس کی روح بنیادی طور پر ایک تھی، لیکن اصطلاحاً بطور اسم علم
کے یہ نام اس دین کو اس وقت دیا گیا جب نبی آخر الزماںؐ کو اس کے بار امانت سے سرفراز کیا گیا

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔　　اب میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔

(المائدہ: ۳)

اس کی شہادت قرآن میں مذکور اس دعا سے بھی ملتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ
کے نام سے ایک نئی امت متعارف کرانے کے لیے کی، غالباً اسی لیے قرآن نے وجہ تسمیہ کے ذکر میں اس کی
نسبت حضرت ابراہیمؑ کی طرف کی ہے: هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ (حج) (حضرت ابراہیمؑ ہی نے
تمہیں مسلم کا نام دیا) عرف عام میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے لیے اسلام کا
لفظ خصوصیت کے ساتھ جو بولا جاتا ہے تو اس میں اسلام کی یہی اصطلاحی تعبیر مراد ہوتی ہے،
اور آج کے موضوع میں بھی بالفعل اسلام کی یہی تعبیر مراد ہے، جس کی تاریخ خدا کے آخری نبی
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کی آخری کتاب قرآن مجید کے نزول سے شروع ہوتی ہے۔

استشراق کی تاریخ کا رشتہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ اور تحریک احیائے علوم سے جوڑا جاتا ہے،
لیکن یہ غلط ہے، استشراق کے لفظ اور اس کے ظاہر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے ؎

میرے ظاہر سے نہ کر اندازۂ باطن مرا

یہ تحریک بہت پرانی ہے، اس کے ڈانڈے ازل سے ملے ہوئے ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

زیر بحث موضوع کے دائرے میں ہم اسلام کے ساتھ اس کے تعلق کے آغاز اور اس کی
نوعیت کا سراغ لگائیں اور عہد بہ عہد اس کی رفتار کار کا جائزہ لیں تو ہم جلد اس نتیجے پر پہونچ
جاتے ہیں کہ الفاظ اور اصطلاحات سے صرف نظر کر کے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ روح استشراق
روز اول سے موجود ہے، موجود ہی نہیں فعال اور سرگرم عمل ہے، حالات کے تحت وہ بھیس
بدلتی رہی، اپنی حکمت عملی تبدیل کرتی رہی، اس کے طریق واردات، حربی تدابیر، زور آزمائی کے
داؤ پیچ میں کمی بیشی ہوتی رہی، اتار چڑھاؤ آتا رہا اور رد و بدل ہوتا رہا، مگر یہ عمل اس وقت سے
لے کر اب تک جاری ہے، اور آئندہ بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے گا، اور اس کا مقصد

ان کے اپنے نقطۂ نظر سے جو بھی ہو، اور وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، ان سے بھی نہیں، ہم سے بھی نہیں، مگر اس کا مقصد ہمارے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ ہمارے دعوئ ایمان اور جذبۂ اسلام کا امتحان ہوتا ہے، اور اللہ یہ دیکھ لے کہ جو لوگ ایمان کے دعویدار ہیں ان میں کون اپنے دین پر ثابت قدم رہتا ہے اور کون گمراہ ہوکر دین سے پھر جاتا ہے، اس کی نشاندہی بھی قرآن مجید نے اپنے زمانۂ نزول ہی میں کر دی تھی، سورۂ بقرہ میں جہاں تحویل قبلہ کا ذکر ہے ذرا مختلف سیاق وسباق میں اس حکمت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (بقرہ : ۱۴۳)

اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف اس لیے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنیوالے ہیں، ان لوگوں سے جو پیٹھ پھیر جانے والے ہیں۔

یہی نہیں، ذرا دور تک گہرائی میں جاکر وقت نظر سے دیکھا جائے تو تصادم کشاکش اور آویزش کی داستان اتنی ہی قدیم ہے کہ جتنی خود انسان، روز ازل آدم اور ابلیس کا قصہ، پھر آدم اور شیطان کا ایک ساتھ ہبوط، دنیوی زندگی میں حق کے ساتھ باطل، اسلام کے ساتھ کفر، ایمان کے ساتھ الحاد کو بھی اپنا کاروبار جاری رکھنے کی کھلی چھوٹ کا مقصد کیا ہے؟ معرکۂ خیر وشر اس دنیا میں کب برپا نہیں رہا، روز ازل سے یہ معرکہ جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا، قصہ کوتاہ یہ کہ وہ روح جسے استشراق کا خوشنما نام دیا جاتا ہے، بہت پرانی ہے، اس کا بھیس بدلتا رہتا ہے، اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات ومنات

جیسا کہ میں نے کہا استشراق ایک تحریک ہے، اس کی ایک تاریخ ہے، اس کا ایک مقصد ہے، اس کے ہاں مقصد کے حصول کا طریقہ بدلتا رہتا ہے، مقصد نہیں بدلتا، اسلام بھی ایک تحریک ہے، اس کی بھی ایک تاریخ ہے، اس کا بھی ایک مقصد ہے، لیکن اس کے ہاں مقصد کی طرح طریقۂ کار بھی نہیں بدلتا، ان دونوں میں فرق کی وجہ ان دونوں کا باہمی اختلاف ہے، یہ اختلاف سطحی نہیں، بلکہ بنیادی ہے، اور اس کا تعلق ان کی فطرت سے ہے، اسلام حق کا علمبردار ہے جو رنگ نہیں بدلتا، استشراق باطل کا حاشیہ بردار ہے جو موقع ومحل دیکھ کر رنگ بدل لیتا ہے، اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق وباطل نہ کر قبول

استشراق کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی اور اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے، کس قسم کے اسکالروں نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے اپنے حالات وکوائف کیا تھے، اس زمرے سے تعلق رکھنے والے مختلف اسکالروں کا رویہ اور طرز عمل مشرق بالخصوص اسلام کے ساتھ کیا رہا ہے، ہمدردانہ یا غیر ہمدردانہ، حقیقت پسندانہ یا متعصبانہ، جانبدارانہ یا غیر جانبدارانہ، روادارانہ یا جارحانہ اور معاندانہ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے اور اب بھی کوئی شخص ان کا تدریجی جائزہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت یا افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر مجھے بالفعل ان سوالات سے تعرض نہیں کرنا ہے، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ استشراق نے ایک روایت، تحریک بلکہ باقاعدہ منظم ادارے کی شکل اختیار کر لی جس کی اپنی ایک تاریخ ہے، یہ تحریک کس طرح پروان چڑھی، کس کے جلو میں مغرب کا یہ ابر رحمت مشرق میں آیا اور اہل مشرق پر سایہ فگن ہوا؟ یہ کوئی سربستہ راز نہیں، مغرب کے افق سے طلوع ہونے والا یہ سورج کیونکر دور دراز کا سفر طے کرتا ہوا مشرق میں لمعہ افگن ہوا، مشرق جسے مبدأ فیاض سے خلقۃً یہ شرف حاصل رہا کہ

اس کے آفاق و مطالع سے آفتاب عالمتاب کا نور ہی نہیں پھیلتا اور ماہتاب کی چاندنی ہی نہیں چھٹکتی بلکہ علم کی روشنی اور دین و مذہب کا اجالا بھی یہیں سے نمودار ہوتا رہا۔ اسے کیسے گہن لگ گیا؟ میں ان امور کو بھی نہیں چھیڑنا چاہتا، یہ طویل طویل بحثیں ہیں، میں جن سے صرف نظر کرکے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

اسلام حق کا پیغام لے کر آیا تو اس کے راستے میں جو لوگ حائل ہوئے اُن میں کفار قریش کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی تھے، یہود و نصاریٰ کی نفسیات بوجوہ اس باب میں کفار قریش سے مختلف تھیں، ان میں نسلی تعصب کے علاوہ مذہبی عصبیت بھی تھی، نسلاً ان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی دوسری شاخ حضرت اسحاقؑ سے تھا، جبکہ داعیِ اسلام کا تعلق اس خاندان سے تھا جو حضرت اسماعیلؑ سے چلا، مذہبی اعتبار سے یہود و نصاریٰ پہلے سے حامل کتاب تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ آخری نبی کی بعثت بھی ان ہی میں ہوگی، خاندانی رقابت کا یہ احساس ان میں اس حد تک غالب تھا کہ انھوں نے قبلہ اور ذبح عظیم کے واقعہ کی اصلیت کو چھپانے کے لیے خود اپنی کتابوں میں تحریفیں کیں، اسلام جب انھیں ایک غالب قوت کی حیثیت سے ابھرتا نظر آیا تو انھوں نے اس کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور حالات کے تحت ادل بدل کر وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو وہ کر سکتے تھے، ان ہی تدابیر میں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی جسے آج کی زبان اور اصطلاح میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے، ظاہر ہے اس کی نسبت اسلام کا رویہ مذمت اور اظہار نکیر ہی کا ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے اس زمانہ میں موجود روح استشراق کی پردہ دری ان الفاظ میں کی ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ

اور کافروں نے کہا اس قرآن کی باتیں نہ سنو اور اس میں گڑبڑ پیدا کر دو تاکہ

لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ

اس طرح تم غالب آجاؤ۔

(حم السجدہ: ۲۶)

آج اسرائیل اور بعض باطل پرست فرقے قرآن مجید کے غلط نسخے چھاپ کر پھیلانے کی جو ناپاک کوششیں کر رہے ہیں، کیا وہ اسی سلسلہ کی کڑی نہیں جس کا ذکر مذکورۂ بالا آیت میں کیا گیا ہے؟

اہل کتاب کے ایک گروہ نے یہ حربہ اختیار کیا کہ ان کے آدمی صبح اسلام لاتے اور شام کو دائرۂ اسلام سے نکل جاتے، تاکہ اس طرح لوگ اسلام سے برگشتہ ہوں جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۲ میں کیا گیا ہے:

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ (آل عمران: ۷۲)

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس کو صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں۔

باطل پرستوں کی ایک چال یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ دو اور کچھ لو کا معاملہ کر کے بیچ کا راستہ اختیار کریں، لیکن حق کے لیے یہ قابل قبول نہیں، آنحضورؐ کے زمانہ میں بھی یہ حکمت عملی موجود تھی جس کی نشاندہی قرآن مجید نے سورۂ نون کی آیت ۹ میں کی ہے:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (نون: ۹)

وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم اپنے موقف سے ہٹو تو وہ بھی ہٹیں۔

یہ رجحان اس زمانہ ہی میں نہیں تھا، بلکہ آج کے استشراق میں بھی موجود ہے، مسلم کرسچین ڈائیلاگ کے عنوان سے آج جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ بیچ کی راہ نکال کر

دفع الوقتی کی جائے، جبکہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، وہ صاف صاف کہتا ہے:

ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً — اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ

اس کے نزدیک دو ہی راستے ہیں، اسلام یا کفر:

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ۔ (بقرہ: ۸۵)

کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو؟

یہ حکمت عملی اس کے نزدیک کفر ہی کی ایک صورت ہے، سورۂ بقرہ کی آیت ۸۵ میں اس طرز عمل کی نشاندہی کر کے صرف دنیوی ذلت اور عذاب آخرت کی دھمکی دی گئی ہے، لیکن سورۂ نساء، کی آیت ۱۵۰ میں اس روش کو حقیقی کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا، أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا۔ (نساء: ۱۵۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں، یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں۔

قرآن مجید کی یہ چند آیات جو اوپر بیان کی گئیں ان کے آئینے میں ہم آج کے مستشرقین اور استشراق کا چہرہ، برافگندہ نقاب دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، قرآن واشگاف الفاظ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے سے منع کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو جو ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں ان کو انہی میں شمار کرتا ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں کس قدر دوٹوک انداز میں اس کی صراحت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ (مائدہ: ۵۱)

اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہے، اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔

عصر حاضر کے مستشرقین یہود و نصاریٰ نہیں تو اور کون ہیں، لیکن یا للعجب کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں نے انہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رسم و راہ رکھنا تو ایک طرف، ان کو استاد کا درجہ دے کر اپنے دل و دماغ کی زمام کار ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے، اسلام اور مسلمانوں سے مستشرقین اور استشراق کے تعلق کے مختلف ادوار ہیں، ایک زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں سے مختلف دنیوی علوم سیکھے، اس میں استادی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی اور اسلامی علوم کی طرف توجہ کی اور بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ ان کے بھی امام بن گئے، اور نوبت بایں جا رسید کہ آج کسی کو طبیعی اور سائنسی علوم میں ہی نہیں عربی اور اسلامیات میں سند فضیلت لینی ہوتی ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کی ان جامعات کا رخ کرتا ہے جہاں یہ نام نہاد اسکالر دام تزویر بچھائے دانہ ڈال کر شکار کی گھات میں بیٹھے ہیں، کیا ان کا مقصد واقعی مسلمان نوجوانوں کو عربی اور اسلامیات پڑھا کر اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا ہے؟ پورے پورے شعبے انھوں نے اس لیے کھول رکھے ہیں کہ مسلمان ذہن تیار ہوں؟ اسکالر شپ میں بڑی بڑی رقمیں وہ اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل پیدا ہوں؟ کوئی ہوشمند ایماندار آدمی اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

استشراق کی تاریخ یہاں پہونچ کر ایک نیا موڑ مڑ چکی ہے، وہ کام جو ایک صدی پہلے عیسائی مبلغین اور مستشرقین کر رہے تھے اب اس کام کے لیے انھوں نے مسلمانوں میں سے آدمی تیار کر دیے ہیں، اقبال کا مصرعہ یاد آتا ہے، انھوں نے ہمارے شاندار ماضی کے لیے کہا تھا

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

آج صنم خانہ کعبہ سے پاسبان حاصل کر رہا ہے، پہلے اس طرح کی اِکّا دُکّا مثالیں تھیں آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتے ہوتے ان کی تعداد اتنی ہوگئی ہے کہ ہم اسے استشراق کے ایک علیحدہ دور سے تعبیر کر سکتے ہیں، میں نے بہت سوچا کہ استشراق کے ان علمبرداروں کو کیا نام دیا جائے، مستشرقین اور استشراق کی جو صحیح تعریف ہم نے آغاز کلام میں متعین کی تھی وہ تو ان پر صادق نہیں آتی، بعض لکھنے والوں نے ان کے لیے مستغربین لکھا ہے، مگر اس کی موزونیت میں مجھے کلام ہے، میں لغویات اور اصطلاحات کے ماہرین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس کے لیے کوئی مناسب لفظ تجویز کریں۔

شیطان اس دنیا میں انسان کو گمراہ کرنے کا مشن لے کر آیا تھا، اس کو جب انسانوں میں ہی ایسے شاگرد مل گئے جو اس کے مشن کو اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تکمیل کرنے لگے تو وہ فارغ ہوگیا، اسی طرح ہمارے مستشرقین بھی اب فارغ ہو چکے ہیں، کچھ وقت گذرنے کے بعد ان کا نام صرف تاریخ میں باقی رہ جائے گا، لیکن اسلام رہے گا اور اسے مستشرقین کی جگہ اس نئی مخلوق سے واسطہ ہوگا جو کام انہی کا کرے گی، لیکن اس کا نام کچھ اور ہوگا، یہ مشیت الٰہی ہے، جو لوگ اسلام کے نام لیوا ہیں، دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں وہ خبردار ہو جائیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

امام ابو حفص ابن شاہین بغدادی

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، ایڈیٹر البلاغ، بمبئی

(سلسلہ کے لیے جولائی ۸۲ء کا معارف دیکھیے)

ابن شاہین فقہائے محدثین میں سے تھے، جو فقہی آراء و احکام میں اجتہاد و قیاس کے مقابلہ میں احادیث و آثار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، اور کسی خاص فقہی مسلک کے بجائے روایت و درایت کے اصول پر عمل کرتے ہیں، کہنا چاہیے کہ اہل رائے اور اہل ظاہر کے درمیان فقہائے محدثین کا مسلک ہے، ابن شاہین اسی مسلک پر تھے، اور اپنے کو شافعی، حنفی، مالکی وغیرہ کے بجائے انا محمدی المذہب (یعنی میں محمدی ہوں) کہتے تھے، اتنی سی بات کو ان کے بعض معاصروں اور حریفوں نے رائی کا پہاڑ بنا دیا اور کہہ دیا کہ ابن شاہین تھوڑی بہت بھی فقہ نہیں جانتے تھے، چنانچہ محمد بن عمر داؤدی کا قول ہے:

وکان ایضاً لا یعرف من الفقہ لا قلیلاً ولا کثیراً، وکان اذا ذکر لہ من مذاھب الفقہاء کالشافعی وغیرہ یقول انا محمدی المذھب[1]

نیز ابن شاہین تھوڑی بہت بھی فقہ نہیں جانتے تھے، اور جب ان کے سامنے امام شافعیؒ اور دیگر فقہاء کا مذہب بیان کیا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ میں محمدی المذہب ہوں۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷

اس کے معاً بعد داؤدی نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں بیان کیا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ابن شاہین کو دارقطنی کی مجلس میں دیکھا کہ وہ دارقطنی سے خوف و ہیبت کے مارے منھ سے ایک لفظ نہیں نکال سکے کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے، اتنے بڑے دعوے پر یہ دلیل بہت چھوٹی ہے، ابن شاہین کو فقہ میں صفر کا درجہ دینا عجیب سی بات ہے، اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بہت سے محدثین کی طرح ابن شاہین بھی شرائع و احکام کے استخراج و استنباط میں احادیث و آثار سے کام لیتے تھے جیسا کہ ان کے کئی شیوخ اسی مسلک کے تھے، چنانچہ ان کے استاذ حدیث امام باغندی (ابوبکر محمد بن محمد بن سلیمان ازدی متوفی ۳۱۲ھ) تفقہ فی الحدیث میں اپنی حذاقت یوں بیان کرتے ہیں:

انا اجیب فی ثلاث مأئة الف مسئلة فی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں تین لاکھ مسائل کے جوابات دیتا ہوں۔

تین لاکھ مسائل کا استحضار صرف حدیث کے متن اور سند کے بارے میں نہیں تھا، بلکہ اس میں فقہی احکام و مسائل بھی تھے، ان کے شیوخ میں حسن ابن احمد بن یزید اصطخری قاضی قم متوفی ۳۲۸ھ فقہ شافعی کے ائمہ مذکورین میں تھے۔

وکان احد الائمة المذکورین وهو من شیوخ الفقهاء الشافعیین[2]

اصطخری شافعی فقہاء میں قابل ذکر اور جلیل القدر امام تھے۔

اسی طرح ابو الحسن عبید اللہ بن حسین کرخی متوفی ۳۴۰ھ فقہ حنفی میں اپنے زمانہ میں آخری حجت مانے جاتے تھے، اور ان کے تلامذہ نے ان کے مسلک اور فقہ و فتویٰ کی دنیا میں اشاعت کی۔

---

[1] المنتظم ج ۶، ص ۱۹۳ [2] المنتظم ج ۶، ص ۳۰۲۔

وانتهت الیه ریاسة اصحاب ابی حنیفة وانتشر اصحابه فی البلاد[1]

فقہائے احناف کی امامت و سیادت امام ابو الحسن کرخی پر ختم تھی، ان کے تلامذہ مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔

ابن شاہین کے تلامذہ میں بھی فقہ و فتویٰ کے ائمہ مذکورین و متبوعین شامل ہیں، چنانچہ ان کے شاگرد ابو محمد عبد الوہاب بن علی بن نصر مالکی متوفی ۴۲۲ھ کے بارے میں خطیب بغدادی نے کہا ہے:

کان فقیهاً علی مذهب مالك وولی قضاء بادرایا وباکسایا .... وکتبت عنه وکان ثقة ولم نلق من المالکیین احداً افقه منه[2]

وہ امام مالک کے مسلک کے فقیہ تھے، بادرایا اور باکسایا کے قاضی تھے... میں نے ان سے حدیث حاصل کی ہے، ثقہ محدث تھے، ہم نے مالکیوں میں ان سے بڑا فقیہ کسی کو نہیں پایا۔

قاضی ابو عبد اللہ صمیری (حسین بن علی بن محمد متوفی ۴۳۶ھ) ائمہ احناف میں نہایت ثقہ بزرگ اور صاحب نظر مانے جاتے ہیں، ابن شاہین کے شاگرد اور خطیب بغدادی کے استاد ہیں، ان کے ذکر میں ہے:

وکان احد الفقهاء المذکورین من العراقیین، حسن العبادة جید النظر ..... وکان صدوقاً

وہ اہل کوفہ کے فقہائے مشاہیر میں سے ایک تھے، عابد، بالغ نظر... صدوق بڑے عقلمند، سلیقہ مند اور علماء کے

---

[1] المنتظم ج ۶، ص ۳۶۹ [2] ایضاً ج ۸ ص ۶۱۔

وافر العقل، جمیل المعاشرۃ — قدردان عالم تھے۔

عارفاً بحقوق العلماء [1]

ان کی کتاب "اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ" ۱۳۹۴ھ میں احیاء المعارف النعمانیۃ حیدرآباد سے شایع ہوئی ہے، جس عالم و محدث کے اساتذہ و تلامذہ میں مختلف فقہی مذاہب کے ایسے فقہائے کبار ہوں، اس کے متعلق یہ کہدینا کہ فقہ میں صفر تھے، اور اس کی دلیل میں اپنا ایک مشاہدہ بیان کر دینا وہ بھی ایک معاصر اور حریف کی مجلس کا، آسانی سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا؛ اسی بات کو ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حمزہ بن یوسف سہمی جرجانی کی روایت سے نقل کیا ہے جس میں صرف ولا یعرف الفقہ (وہ فقہ نہیں جانتے تھے) لکھا ہے، پھر وہی دارقطنی کی مجلس والی بات لکھی ہے، یہ بات اس حد تک قابل تسلیم ہوسکتی ہے کہ وہ اہل رائے کی فقہ سے زیادہ واقف نہیں تھے، اس لیے اپنے کو محمدی المذہب کہا کرتے تھے۔

ابن شاہین عمر میں دارقطنی سے نو[9] سال بڑے تھے، دونوں کے شیوخ و اصحاب ایک ہی طبقہ کے تھے، دونوں اصحاب درس و تصنیف اور حفظ و اتقان ثقاہت و عدالت میں برابر تھے، دارقطنی کی جلالت شان احادیث و علل اور رجال میں مسلم مگر ابن شاہین بھی کچھ کم نہ تھے، بےشک وہ فقہ و فتویٰ میں کسی خاص مکتب فکر سے منسلک نہیں تھے، بلکہ محدثین کا طریقہ فقہی مسلک رکھتے تھے، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ بالکل ہی فقہ نہیں جانتے تھے اور دارقطنی کے مقابلہ میں طفل مکتب سے بھی کم حیثیت رکھتے تھے۔

لحن یعنی حدیث میں اعرابی غلطی

ابن شاہین کے بارے میں دارقطنی کے حلقہ سے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ وہ لحان تھے، اور لحن پر اصرار کیا کرتے تھے، محمد بن عمر داؤدی نے کہا ہے:

کان ابن شاھین شیخاً ثقۃ — ابن شاہین شیخ، ثقہ تھے، مشائخ سے

[1] المنتظم ج ۸، ص ۱۱۹۔

یشبہ الشیوخ الا انہ کان لحاناً [1] — مشابہت رکھتے تھے، البتہ لحان تھے۔

حمزہ بن یوسف سہمی نے یہی بات دارقطنی سے منسوب کر کے بیان کی ہے:

سمعت الدارقطنی یقول: ابن شاھین بقیۃ الشیوخ الا انہ کان لحاناً ولا یعرف الفقہ [2] — میں نے دارقطنی سے سنا ہے کہ ابن شاہین بقیۃ الشیوخ ہیں، البتہ وہ بہت زیادہ اعرابی غلطی کرتے تھے، اور فقہ نہیں جانتے تھے۔

حمزہ کی دوسری روایت میں ہے:

سمعت الدارقطنی یقول: ابوحفص عمر بن احمد ابن شاھین یلح علی الخطأ وھو ثقۃ [3] — میں نے دارقطنی سے سنا ہے کہ ابوحفص عمر بن احمد ابن شاہین غلطی پر اصرار کرتے ہیں، اور وہ ثقہ ہیں۔

محدثین کے نزدیک زبان میں لکنت یا عجمیت یا کسی اور وجہ سے حدیث میں اعرابی غلطی کو لحن کہتے ہیں، ایسی حدیث صحیح ہوتی ہے مگر لحن کی تصحیح ضروری ہے [4]۔

داؤدی اور دارقطنی نے ابن شاہین کو یشبہ الشیوخ، بقیۃ الشیوخ، شیخ، ثقہ مانتے ہوئے لحن اور اعرابی غلطی پر اصرار کرنے والا بتایا ہے، جہاں تک لحن کا تعلق ہے بڑے بڑے ائمہ حدیث سے ہوا ہے، بلکہ بعض حضرات شدت احتیاط کی وجہ سے اگر کوئی حدیث ملحون سنی ہے تو اسی طرح اس کی روایت کرتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے امام اعمشؒ سے کہا کہ ابن سیرینؒ ایسی حدیث سنتے ہیں جس میں لحن ہوتا ہے تو اس کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، اس پر اعمشؒ نے

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۸۴ [3] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸، لسان المیزان ج ۴ ص ۲۸۴ [4] المحدث الفاصل بین الراوی والواعی ص ۵۲۴۔

کہا کہ اگر ابن سیرینؒ اعرابی غلطی کرتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ لحن کو درست کر لینا چاہیے[1] ابن جریج کا بیان ہے:

کنا نرید ان نردنا فعًا عن اللحن فلا یرجع[2]	ہم چاہتے تھے کہ حضرت نافع کو لحن سے روکیں، مگر وہ نہیں رکتے تھے۔

اور اسمٰعیل بن امیہ نے کہا ہے:

کنا نرید نافعًا علی ان لا یلحن فیابی الا الذی سمع[3]	ہم لوگ چاہتے تھے کہ نافع لحن نہ کریں مگر وہ جیسا سنتے تھے اسی پر وہ کرانکار کر دیتے تھے

یہ شدت احتیاط محدثین کے نزدیک مستحسن نہیں ہے، بلکہ لحن کی اصلاح و تصحیح ضروری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اس سے بری تھے اور بعد کے رواۃ کی وجہ سے یہ غلطی ہوتی تھی جس کا ازالہ واجب ہے۔

ہمارے خیال میں ابن شاہین کے لحن کی بڑی وجہ ان کا اپنے فروع کا اصول سے معارضہ و مقابلہ نہ کرنا ہی ہے، مگر یہ کہنا کہ وہ لحان یعنی بہت زیادہ غلطیاں کرتے تھے اور اس پر اڑے رہتے تھے ان کے مقام ثقاہت و امانت سے بعید ہے اور اس میں معاصرانہ رنگ معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر و قرارت امام ابن شاہین جن علوم میں خاص شہرت رکھتے تھے ان میں تفسیر اور تجوید و قرارت بھی ہے، یافعی نے مرآۃ الجنان میں، ابن عماد نے شذرات الذہب میں ان کے تعارفی القاب میں "المفسر" بھی لکھا ہے، نیز داؤدی نے طبقات المفسرین میں اور ابن جزری نے طبقات القرا میں مفسر اور مقری کی حیثیت سے ان کا مستقل تذکرہ کیا ہے، انھوں نے التفسیر الکبیر ایک ہزار اجزا میں تصنیف کی ہے، تجوید و قرارت کے ائمہ اور قرآنی علوم کے ماہرین سے تعلیم حاصل کی تھی،

[1] الکفایہ ص ۱۹۴ [2] المحدث الفاصل ص ۵۲۸ [3] الکفایہ ص ۱۸۷۔

طبقات القرا میں ہے:

وروی الحروف عن ابی بکر بن ابی داؤد وابی بکر بن مجاھد وابی بکر النقاش و احمد بن مسعود بمصر[1]	ابن شاہین نے قرارت کی روایت ابوبکر بن ابوداؤد، ابوبکر بن مجاہد، ابوبکر نقاش اور احمد بن مسعود سے مصر میں کی ہے۔

ابوالقاسم بزاز مقری (ایوب بن یوسف بن ایوب) بھی ان کے استاد ہیں۔

ابن شاہین نے احادیث کی روایت کے ساتھ تجوید و قرارت کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور اس فن میں ان کے نامی گرامی شاگرد گذرے ہیں، ان میں ابوعلی نرسی بزاز (حسن بن محمد بن عمر ابن مدیہ) من اھل القرآن والمعرفۃ بالقراءات تھے، اسی طرح ابوالفضل بزاز (محمد بن عبید اللہ بن احمد) من القراء المجودین تھے، نیز حسین بن طباطبری نے ان سے قرارت حاصل کی۔

وعظ و تذکیر علماء و محدثین نے ہمیشہ سے تدریس و تصنیف کے ساتھ وعظ و تذکیر کا شغلہ بھی جاری رکھا ہے اور عامۃ المسلمین میں ایمان و عمل کی قوت قصص و عبر اور ترغیب و ترہیب کے ذریعہ پیدا کی ہے، امام ابن شاہین وعظ گوئی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تاریخ بغداد، تذکرۃ الحفاظ، العبر، لسان المیزان، مرآۃ الجنان، شذرات الذہب، طبقات المفسرین اور الرسالۃ المستطرفہ میں ان کو دیگر القاب کے ساتھ الواعظ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور ان کے بعد وعظ و تذکیر کا سلسلہ ان کے خاندان میں جاری رہا، چنانچہ ان کے صاحبزادے ابوالقاسم عبید اللہ اپنے والد کی طرح ابن شاہین کی کنیت کے ساتھ الواعظ کے لقب سے بھی مشہور تھے، ابن شاہین اس فن میں اپنے استاذ شیخ ابوالحسن الواعظ (علی بن محمد بن محمد متوفی ۳۳۸ھ) سے خصوصی تلمذ و نسبت رکھتے تھے،

[1] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲

خطیب نے لکھا ہے کہ وہ زہد ورقائق میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں اور حضرات صوفیہ ومشایخ کی طرح مجالس وعظ منعقد کیا کرتے تھے، جن میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں، شیخ ابو الحسن واعظ نہایت وجیہ و شکیل تھے، اس لیے مجلس وعظ میں اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا کرتے تھے، تاکہ کسی فتنہ کا خطرہ نہ رہے، ایک مرتبہ ابن شاہین کے دوسرے استاد شیخ ابو بکر نقاش جو خود بھی بڑے عابد وزاہد اور باخدا بزرگ تھے، شیخ ابو الحسن واعظ کی مجلس وعظ میں چھپ کر بیٹھے اور وعظ ختم ہونے کے بعد مجمع کو چیرتے ہوئے ان کے پاس گئے اور کہا:

ایھا الشیخ! القصص بعدک حرام[۱] — اے شیخ! آپ کے بعد وعظ و قصص گویا حرام ہے۔

ابن شاہین کے متعدد شاگرد اپنے دور کے کامیاب واعظ و مذکر تھے، ان کے ایک شاگرد ابو علی حسن بن علی بن محمد تمیمی متوفی ۴۴۴ھ "ابن المذہب الواعظ" کے لقب سے مشہور ہیں، نیز ان کی تلمیذہ خدیجہ بنت محمد بن علی شاہجہانیہ صوفیہ متوفیہ ۴۶۰ھ الواعظہ کے لقب سے طبقہ عباد و زہاد میں پہچانی جاتی ہیں۔

زہد و مشیخت امام ابن شاہین مشایخ محدثین میں سے ہیں، دارقطنی نے ان کو بقیۃ الشیوخ اور قاضی محمد بن عمر داؤدی نے یشبہ الشیوخ کہا ہے، اس دور کی علمی اور دینی اصطلاحات میں طبقہ علماء و محدثین میں شیوخ اور مشایخ کا اطلاق ان حضرات پر ہوتا تھا جو رسمی صوفیہ میں سے نہیں تھے، مگر زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، روحانیت و مشیخت کی زندگی بسر کرتے اور دوسرے علماء کے مقابلہ میں ان پر یہ رنگ زیادہ نمایاں رہتا تھا، ابن شاہین ثقہ و مامون حافظ حدیث اور محدث عراق ہونے کے ساتھ زہد و مشیخت میں ممتاز مرتبہ رکھتے تھے، ان کے وعظ و تذکیر کا مشغلہ اسی کا ایک

[۱] المنتظم ج ۷، ص ۳۶۵۔

شعبہ تھا، ابو عبد الرحمن سلمیؒ نے طبقات الصوفیہ میں مشہور صوفی و بزرگ حضرت شیخ ابو محمد عبد اللہ بن فیق انطاکیؒ کے تذکرہ میں ابن شاہین سے ایک حدیث روایت کی ہے جو دو واسطوں سے شیخ انطاکیؒ کی سند سے مروی ہے۔[۱]

زہد ورقائق میں ان کی دو اہم کتابیں ہیں، ایک کتاب الزھد جو بقول ان کے ایک سو اجزاء میں ہے اور دوسری کتاب الترغیب جس کا ذکر طبقات المفسرین میں ہے، ابو بکر خوارزمی کا بیان ہے کہ ۳۷۱ھ میں امام ابو بکر اسماعیلیؒ کی وفات جرجان میں ہوئی، جب اس حادثہ فاجعہ کی خبر بغداد پہنچی تو وہاں کے فقہاء، محدثین، اشراف اور تجار تین یا پانچ دن تک فقیہ ابو القاسم دارکیؒ کے پاس ان کی مسجد میں تعزیت کے لیے آتے رہے، مشایخ محدثین میں جو حضرات تشریف لائے تھے ان میں ابو حفص ابن شاہین بھی تھے۔[۲]

ابن شاہین کے کئی شیوخ طبقہ مشایخ اور عباد و زہاد میں سے تھے، جن کی مقدس زندگی کا پرتو ان پر پڑا اور ان کے زمرے میں شمار ہوئے، مثلاً شیخ ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن دینار معدل زاہد متوفی ۳۳۸ھ نہایت بزرگ اور ثقہ محدث اور فقہ حنفی کے ائمہ کبار میں سے تھے، فقر و فاقہ اور صبر و قناعت کے ساتھ قیام و صیام کی زندگی بسر کرتے تھے، اپنے ہاتھ سے رزق حلال کماتے تھے، ہر دس سال کے بعد حج اور ہر تین سال کے بعد جہاد کرتے تھے۔

شیخ ابو الفضل عباس بن یوسف شکلیؒ متوفی ۳۱۴ھ مشہور صوفی و بزرگ حضرت سری سقطیؒ سے شرف بیعت و تلمذ رکھتے تھے، نہایت صالح اور عبادت گذار عالم تھے، شیخ ابو احمد عبد الواحد بن محمد بن مہتدی باللہ ہاشمی متوفی ۳۱۷ھ صلاح و تقویٰ، دینداری و پرہیزگاری میں "راہب بنی ہاشم" کا لقب رکھتے تھے، شیخ حسن بن احمد بن یزید اصطخریؒ متوفی ۳۲۸ھ عابد و زاہد اور قانع محدث تھے،

[۱] طبقات الصوفیہ ص ۱۴۲ [۲] تاریخ جرجان سہمی ص ۷۲۔

شیخ ابو محمد خواص جعفر بن محمد بن نصیر خلدیؒ متوفی ۳۴۸ھ کی دینداری اور زہد و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ساٹھ مرتبہ حج ادا کیا۔

اسی طرح ابن شاہین کے اصحاب و تلامیذ میں کئی حضرات درجۂ مشیخت پر فائز تھے، اور زہد و تقویٰ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے، مثلاً شیخ ابو الحسین محمد بن علی بن محمد ابن الغریق متوفی ۴۶۵ھ صلاح و تقویٰ اور زہد و عبادت کی وجہ سے زاہد بنی ہاشم کہے جاتے تھے، شیخہ خدیجہ بنت محمد بن علی شاہجانیہؒ متوفیہ ۴۶۰ھ نہایت عابدہ زاہدہ خاتون تھیں اور واعظہ کے لقب سے مشہور تھیں، شیخہ فاطمہ بنت محمد بن عباس طرزیہ صوفیہؒ متوفیہ ۴۱۲ھ طبقۂ صوفیہ میں اعلیٰ مقام رکھتی تھیں، شیخ ابو عبد الرحمٰن سلمیؒ متوفی ۴۱۲ھ نے طبقات الصوفیہ میں ابن شاہین سے روایت کی ہے۔

درس و تدریس | امام ابن شاہین نے ۳۰۸ھ میں گیارہ سال کی عمر میں حدیث کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی، اور ۳۳۲ھ میں بصرہ میں حدیث کا پہلا حلقۂ درس قائم کرکے تدریسی سلسلہ قائم کیا، ان کا بیان ہے:

واول ما حدثت بالبصرة	سب سے پہلے میں نے بصرہ میں ۳۳۲ھ
سنة اثنتين وثلاثين وثلث	میں درس حدیث دیا۔
مائة۔[1]	

وہ حدیث پڑھانے کے لیے مجلس املاء قائم کرتے تھے، جس میں اس کثرت سے طلبہ شریک ہوتے تھے کہ مجمع میں ان کی آواز پہونچانے کے لیے ایک مستقل مستملی کی ضرورت پڑتی تھی، مجلس املاء کی صورت یہ ہوتی تھی کہ استاد اپنی مرویات و مسموعات کو طلبہ کے سامنے رکھ کر یا زبانی سناتا تھا اور مجمع تک اس کی آواز مستملی پہونچاتا تھا، جس کو سن کر طلبہ لکھ لیتے تھے، بہت سے محدثین کے حلقۂ درس میں اس قدر ہجوم

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۲۶۷۔

ہوتا تھا کہ کئی کئی مستملی اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔

ابن شاہین کے حلقۂ درس کے مستقل مستملی ابو عبد اللہ عثمان بن احمد بن جعفر عجلی تھے، خطیب نے ان کو مستملی ابی حفص ابن شاہین لکھا ہے، وہ خود بھی بہت بڑے محدث تھے، ابو عبد اللہ بن عفیر، ابو القاسم بغوی، عبد اللہ بن ابی داؤد، محمد بن عبید اللہ بن علاء الکاتب، حسین بن اسمٰعیل محاملی، قاسم بن اسماعیل محاملی، محمد بن مخلد، عبد اللہ بن جعفر بن فارس اصبہانی سے حدیث کی روایت کی ہے، اور ان سے خلال، عتیقی، عبد العزیز ازجی، محمد بن علی بن فتح نے روایت کی ہے، اور خطیب بغدادی نے ان حضرات کے واسطہ سے ابو عبد اللہ بن عثمان بن احمد عجلی سے روایت کی ہے۔[1]

ابن شاہین نے ضبط و اتقان اور حافظہ پر اعتماد کی وجہ سے مجلس درس میں اپنے شیوخ سے سنی ہوئی احادیث کا اصل نسخہ سامنے نہیں رکھتے تھے، بلکہ اس سے منقول نسخہ سے حدیث بیان کرتے تھے، اور ان کا اعلان تھا کہ میں اپنے لکھے ہوئے نسخہ کا اصل سے مقابلہ و معارضہ نہیں کرتا ہوں، اس صورت میں منقول نسخہ میں غلطی کا قوی امکان ہوتا ہے اس لیے ان کے کچھ شاگردوں نے امام مسعود ثقفی سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ تم لوگ ابن شاہین کے ضبط و اتقان پر پورا اعتماد رکھو، اگر وہ کسی ٹھیکری یا پیوند پر لکھی ہوئی حدیث بیان کریں تو لکھ لیا کرو، ابن شاہین کے مشہور شاگرد ابو بکر برقانی نے ان کے اصل اور نقل میں مقابلہ نہ کرنے کی وجہ سے ان سے زیادہ روایت نہیں کی، حالانکہ خود ابو بکر برقانی کا یہی طریقہ تھا، خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ انھوں نے بہت سی حدیثیں یہ کہہ کر بیان کیں کہ ہم سے فلاں نے یہ حدیث بیان کی ہے اور اصل سے مقابلہ نہیں کیا ہے۔

ابن شاہین کے پاس مرویات و مسموعات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، جس کی وہ روایت کرتے تھے اور دور دراز مقامات سے ان کے حلقۂ درس میں کثیر تعداد میں جمع ہوتے، صرف ایک استاذ

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۳۱۰۔

امام نبوی کی احادیث ان کے پاس سات سو یا آٹھ سو اجزاء میں تھیں، ایک مرتبہ ان کی کتابیں ضایع ہوگئی تھیں تو اپنے حافظے سے بیس ہزار یا تیس ہزار حدیثیں لکھ کر اس عظیم نقصان کی تلافی کی، ایک مرتبہ ان کے ایک شاگرد ابو عمرو النقادی مخرمی نے ان کی سند سے حدیث بیان کرتے ہوئے تدلیس کی، جو محدثین کے نزدیک بہت بڑا عیب ہے، اور یوں کہا، حدثنا عمر بن احمد النقاش، جب ابن شاہین کو اس کی خبر لگی تو اس پر نکیر کی، کیونکہ اس سے ان کی ثقاہت میں فرق آتا تھا، ان کے ایک مشہور استاذ ابوبکر نقاش تھے جو اپنی جلالت شان کے باوجود منکر روایات بیان کرنے کی وجہ سے ضعیف مانے جاتے تھے۔

دارقطنی اور داؤدی نے کہا ہے کہ ابن شاہین احادیث میں اعرابی غلطی کر کے اس پر اصرار کرتے تھے، چونکہ وہ اپنی کتابوں کا اصل نسخہ سے مقابلہ نہیں کرتے تھے، اس لیے لحن اور غلطی کا امکان ہے، مگر بار بار ایسی غلطی کر کے اس پر اصرار ابن شاہین کی ثقاہت و امانت سے بعید معلوم ہوتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ان کے بعض ثقہ معاصر آنکھیں بند کر کے ان کی حدیث کے سماع و کتابت کا مشورہ نہ دیتے، اور ان کے حلقۂ درس میں زبردست ہجوم نہ ہوتا، جس کے لیے مستملی (املاء کرانے والے) کی ضرورت پڑتی تھی۔

ابن شاہین کے ہزاروں اصحاب و تلامیذ میں ابن الغریق ان کے خاتمۃ الاصحاب ہیں جو دنیا میں ان کے آخری شاگرد رہ گئے تھے اور ۴۶۵ھ میں انتقال کیا، ابن جوزیؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

وکان غزیر العلم والعقل رحل	ابن الغریق وافر علم و عقل رکھتے تھے، لوگ
الناس الیہ من البلاد لعلو	دور دراز شہروں سے سفر کر کے سند عالی
اسنادہ وکان آخر من حدث	کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے

فی الدنیا عن الدارقطنی و	وہ دنیا میں آخری عالم تھے جو دارقطنی،
ابن شاہین وابی بکر بن درست[1]	ابن شاہین اور ابوبکر بن درست سے روایت کرتے تھے

ابن الغریق کے ذریعہ ابن شاہین کی مرویات دنیا میں خوب پھیلیں اور دور دراز ملکوں میں ان کا دینی اور علمی فیض پہونچا۔

اصحاب و تلامیذ — امام ابن شاہین کا سلسلۂ درس ۳۳۲ھ میں شروع ہوا، اور ان کی وفات ۳۸۵ھ میں ختم ہوا، اس بیالیس تینتالیس سال کی مدت میں ان سے ہزاروں علماء و محدثین نے حدیث کی روایت کی، جن کے ذریعہ ان کا علمی اور دینی فیض دنیا میں عام ہوا، ان میں سے چند مشاہیر تلامذہ کے نام اور حالات تاریخ بغداد، المنتظم، طبقات الشافعیہ اور تاریخ جرجان وغیرہ میں درج ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے علماء و محدثین کو ابن شاہین سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

تصنیف و تالیف — امام ابن شاہین چوتھی صدی کے صاحب تصانیف کثیرہ محدث ہیں، ان کے اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کے اوصاف و کمالات میں اس کا ذکر کیا ہے، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور العبر میں، یافعی نے مرآۃ الجنان میں، ابن عماد نے شذرات الذہب میں ان کو صاحب التصانیف لکھا ہے اور کتانی نے الرسالۃ المستطرفۃ میں صاحب التصانیف العجیبۃ کے الفاظ سے یاد کیا ہے، ان کے شاگرد قاضی ابو الحسین ہاشمی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

وصنفت ثلث مأئۃ مصنّف	میں نے تین سو تیس (۳۳۰) کتابیں تصنیف
وثلاثین مصنّفا. احدھا	کی ہیں، ان میں سے التفسیر الکبیر ایک ہزار
التفسیر الکبیر الف جزء	جزء میں، مسند ڈیڑھ ہزار جزء میں،

[1] المنتظم ج ۸، ص ۲۸۳۔

والمسند الف جزء وخمسمائة جزء، والتاریخ مائة وخمسین جزءًا، والزهد مائة جزء۔

التاریخ ڈیڑھ سو جزء میں، اور الزہد ایک سو جزء میں ہے۔

دوسرے شاگرد محمد بن ابی الفوارس کا قول ہے:

صنف مالم یصنفه احد [1]

ابن شاہین نے جس قدر کتابیں تصنیف کیں کسی دوسرے نے نہیں کیں۔

طبقات المفسرین میں ہے:

وجمع الابواب والشیوخ و صنف ثلث مائة وثلاثین مصنفًا [2]

انھوں نے ابواب وشیوخ پر تین سو تیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔

کثیر التصانیف علماء کو اپنی کتابوں کی تنقیح وتہذیب کا موقع کم ملتا ہے، وہ کہتے تھے کہ میں نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں ان کا اصل سے مقابلہ نہیں کیا ہے، اس کا اندازہ ان کی کتاب تاریخ اسماء الثقات سے ہوتا ہے جو خوش نصیبی سے ہمارے پاس موجود ہے، اس میں کثرت سے مکررات نظر آتے ہیں۔

ابن شاہین کی بسیار نویسی کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ بر سبیل تذکرہ اور تحدیث نعمت کے طور پر بتایا کہ میں اب تک چار سو رطل روشنائی سے لکھ چکا ہوں، ابوبکر محمد بن عمر داؤدی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن شاہین نے بتایا کہ میں نے اس وقت تک جس قدر روشنائی خریدی ہے اس کا حساب لگایا تو مجموعی قیمت سات سو درہم ہوئی، داؤدی کہتے ہیں کہ ہم لوگ اس زمانہ میں ایک درہم کی چار رطل روشنائی خرید اکرتے تھے، اس کے بعد بھی ابن شاہین ایک مدت تک لکھتے رہے [3]۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷ [2] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲ [3] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷۔

روشنائی کی یہ حیرت انگیز مقدار علمائے مصنفین کے حلقہ میں استعجاب ہی کی نظر سے نہیں دیکھی گئی، بلکہ اس کو ان کی کھلی کرامت قرار دیا گیا، سیوطی نے اپنی کتاب منتہی العقول ومنتہی النقول میں لکھا ہے:

ومداد تصانیفه انتهی الی ثمانية وعشرین قنطارا۔ قال ابن الجوزی قلت هذا من طی الزمان [1]

ان کی تصانیف میں استعمال شدہ روشنائی کی مقدار اٹھائیس قنطار تک پہونچی ہے اور ابن جوزی نے اس کو طی الزمان کی کرامت بتایا ہے۔

امام ابن جوزی خود صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، انھوں نے اپنے قلم کے تراشوں کو جمع کرکے وصیت کی تھی کہ ان کی میت کے غسل کا پانی ان ہی تراشوں سے گرمایا جائے، وہ ابن شاہین کی استعمال کردہ روشنائی کی مقدار کو "طی الزمان" کی کرامت قرار دیتے ہیں، یعنی ان کے لیے زمانہ کی وسعتیں سمٹ آئی تھیں اور تصنیف وتالیف کا جو کام کئی صدیوں میں ہوتا ہے انھوں نے چند سالوں میں کر دکھایا اور جس قدر سیاہی کئی صدیوں میں خرچ ہو سکتی ہے چند سالوں میں خرچ کی۔

ابن شاہین کے تصنیفی کارناموں میں بھی ان کے بعض معاصرین کو کلام ہے، اور وہ اس کو دارقطنی کا فیض قرار دیتے ہیں، ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن یزداذ کا بیان ہے کہ ابوبکر ابن البقال نے مجھ سے کہا:

کان ابن شاهین یسألنی عن کلام الدارقطنی علی الاحادیث فاخبره فیعلقه تعریف کوی بعد ذلک فی اثناء تصانیفه [2]

ابن شاہین مجھ سے احادیث کے بارے میں دارقطنی کے آراء واقوال معلوم کرتے اور میں بتاتا تو ان کو ٹانک لیتے، اس کے بعد ان کو اپنی تصانیف میں ذکر کرتے۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۳، ص ۱۱۷ [2] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸۔

ابن یزداذ کا بیان ہے کہ ابن بقال کے نزدیک ابن شاہین ضعیف ہیں، غالباً ابن بقال پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ابن شاہین کی تضعیف کی ہے، ہو سکتا ہے کہ ابن شاہین نے دارقطنی کو روایۃ الاکابر عن الاصاغر کے انداز میں کبھی استفادہ کیا ہو، مگر اس روایت سے یہ سمجھنا کہ ابن شاہین اپنی کتابیں اسی طرح لکھتے تھے، ان کے ثقہ، حافظ الحدیث اور محدث عراق ہونے کے عین منافی ہے، ایسا الزام ابن شاہین اور دارقطنی دونوں بزرگوں کی جلالت شان کے خلاف ہے۔

ابن شاہین کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں ایک نہایت سخت اور نازیبا بات دارقطنی کی طرف منسوب کی گئی ہے، جس کے دو راوی ہیں، ایک قاضی ابو بکر محمد بن عمر ابن اسمٰعیل داؤدی جن کا بیان تاریخ بغداد میں یوں ہے:

وقال لی الدارقطنی یوماً	دارقطنی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ
ما اعمیٰ قلب ابن شاھین احمل الیّ	ابن شاہین کا دل کس قدر اندھا ہے
کتابہ الذی صنفہ فی التفسیر	انھوں نے تفسیر میں جو کتاب لکھی ہے اسے
وسألنی ان اصلح ما اجد فیہ	لے کر میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اس میں
من الخطأ فرأیتہ قد نقل	جو غلطی دیکھوں اس کی اصلاح کر دوں،
تفسیر ابی الجارود وفرقہ	چنانچہ میں نے دیکھا کہ انھوں نے تفسیر
فی الکتاب وجعلہ عن ابی	ابی الجارود کو نقل کر کے کتاب میں پھیلا دیا
الجارود عن زیاد بن المنذر	ہے اور اس کو عن ابی الجارود،
وانما ھو عن ابی الجارود زیاد	عن زیاد بن المنذر کی سند سے
بن المنذر[۱]	بیان کیا ہے، حالانکہ یہ عن ابی الجارود

۱ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸۔

زیاد بن المنذر ہے۔

اور دوسرے راوی حمزہ بن یوسف سہمی کا بیان تذکرۃ الحفاظ میں معمولی سے لفظی فرق کے ساتھ یہی ہے، البتہ اس میں آخری الفاظ یوں ہیں:

فرأیتہ قد نقل تفسیر ابی الجارود	میں نے ابن شاہین کی تفسیر دیکھی، انھوں نے
فی موضع جعلہ عن ابی الجارود	ایک موقع پر تفسیر ابی الجارود نقل کر کے اس کو
عن زیاد بن المنذر الخ[۱]	عن ابی الجارود، عن زیاد بن المنذر
	بتایا ہے، حالانکہ الخ۔

داؤدی کی روایت کے مطابق دارقطنی نے ابن شاہین کی تفسیر میں متعدد مقامات پر عن ابی الجارود، عن زیاد بن المنذر دیکھا، جس سے معلوم ہوا کہ ابن شاہین ابو الجارود اور زیاد بن منذر کو دو جدا جدا شخصیت سمجھ رہے ہیں اور ان کو اتنا پتہ نہیں چلا کہ ابو الجارود کنیت اور زیاد بن منذر نام ہے، اور یہ ایک ہی شخص ہے، اسی پر انھوں نے ابن شاہین کو سخت کور دل بتایا، اور حمزہ سہمی کی روایت میں ہے کہ ابن شاہین نے اپنی تفسیر میں ایک جگہ ایسا لکھا تھا اور ایک شخصیت کو دو سمجھا تھا جس پر دارقطنی نے ان کو کور دل کہا۔

ابن شاہین رجال و طبقات کے زبردست عالم تھے، ان کی کتاب التاریخ اور کتاب اسماء الثقات سے ابن حجر نے الاصابۃ اور تہذیب التہذیب میں بار بار استفادہ کیا ہے اور اس بارہ میں وہ مرجع و ماخذ ہیں، لہٰذا یہ سمجھنا کہ ان کو ابو الجارود زیاد بن منذر کے بارے میں اتنی خبر نہیں تھی کہ وہ باربار اس کو دو شخصیت سمجھ کر عن ابی الجارود عن زیاد بن المنذر لکھتے تھے، بالکل قرین قیاس نہیں ہے، اور اگر ایک آدھ مقام پر ایسا تھا تو یہ سبقت قلم یا

۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۴۸۔

زلت قلم کا نتیجہ ہے، خاص طور سے ایسی حالت میں جب کہ ابن شاہین بقول خود اپنی کتابوں کا معاوضہ ومقابلہ نہیں کرتے تھے، ان میں کور کسر کا پایا جانا یقینی تھا، اس معمولی سی بات پر ان کو اتنا سخت لقب دے دینا مناسب نہیں تھا، اس قسم کے اوہام بڑے بڑے ائمہ حدیث کی تصانیف میں ملتے ہیں، ابن شاہین ہی کیوں مورد عتاب بنیں؟ ابن ابی حاتم رازی کی کتاب بیان خطأ البخاری فی تاریخہ اور خطیب بغدادی کی کتاب موضح اوھام الجمع والتفریق[1] خاص طور سے اسی موضوع پر لکھی گئی ہے، اور اس قسم کے اوہام واخطاء اہل علم کی جلالت شان کے منافی نہیں، بلکہ ان کے کمالات میں شامل ہیں، حضرت احنف ابن قیس نے صحیح کہا ہے

الکامل من عدت سقطاتہ
کامل وہ انسان ہے جس کی لغزشیں شمار کی جائیں۔

ہمارے خیال میں ابن شاہین پر دارقطنی کے عتاب کی بڑی وجہ ان کا تفسیر ابوالجارود سے نقل کرنا ہے، جو روافض کے فرقہ جارودیہ کا امام اور حضرت امام محمد باقر (ابوجعفر محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب متوفی سنہ ۱۱۷ھ) کی طرف منسوب ایک تفسیر کا مصنف ہے، شمس الدین داؤدی نے طبقات المفسرین میں امام محمد الباقر کے ذکر میں لکھا ہے:

لہ تفسیر رواہ عنہ زیاد بن المنذر ابوالجارود الکوفی الاعمیٰ رئیس الجارودیۃ الزیدیۃ من الرافضۃ[2]
ان کی ایک تفسیر ہے جس کو ان سے ابوالجارود کوفی نے روایت کیا ہے، وہ اعمیٰ (اندھا) اور روافض کے فرقۂ جارودیہ زیدیہ کا امام ہے۔

غالباً فرقۂ جارودیہ کے بانی اور رئیس ابوالجارود اعمیٰ کی مناسبت سے دارقطنی نے

---

[1] موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۶ [2] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۱۹۹۔

ما اعمی قلب ابن شاہین کا فقرہ چست کیا ہے، ابن شاہین محمدی المذہب ہونے کے دعویدار بن کر ابوالجارود زیاد بن منذر کوفی (متوفی بین سنہ ۱۵۰ھ وسنہ ۱۶۰ھ) جیسے بانی فرقۂ جارودیہ رافضیہ اور وضّاع وکذّاب رافضی کی تفسیری روایات کو اپنی تفسیر میں جگہ جگہ استدلال واستفادہ کے طور پر درج کریں اور ہر جگہ لاعلمی یا تدلیس کے خیال سے اس کے نام میں لفظ عن کا اضافہ کر کے اس کو دو شخصیت یا دوسری شخصیت قرار دیں، یہ بات آسانی سے تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے، البتہ یہ قرین قیاس ہے کہ ابن شاہین نے اپنی تفسیر میں کسی موقع اور مطلب سے تفسیر ابوالجارود سے کوئی عبارت نقل کی ہو اور اس میں سہواً ابوالجارود اور زیاد بن منذر کے درمیان عن لکھ گیا ہو، پھر یہ بھی محل نظر ہے کہ ابن شاہین دارقطنی کے اس قدر معترف اور قائل ہوں کہ ان کی مجلس میں مارے خوف کے لب کشائی نہ کر سکیں، احادیث کے بارے میں دوسروں سے ان کی باتیں سن کر اپنی کتابوں میں درج کریں اور اپنی تفسیر خود لے جا کر ان کی اغلاط کی تصحیح کی گذارش کریں، حالانکہ وہ دارقطنی سے عمر میں نو سال بڑے تھے، اور دارقطنی چھوٹے ہونے کے باوجود ابن شاہین کو بقیۃ الشیوخ اور ثقہ کہہ کر لحّان، مصر علی اللحن، فقہ میں صفر اور دل کا اندھا بتائیں۔

ان واقعات میں دونوں راوی داؤدی اور سہمی کے بیان میں اختلافات بھی ہیں، خطیب بغدادی نے تفسیر والی بات کے علاوہ تمام باتوں کو داؤدی کی طرف منسوب کیا ہے، یعنی یہ سب اقوال ابن شاہین کے بارے میں داؤدی کے ہیں، اور سہمی نے بتایا ہے کہ میں نے یہ باتیں دارقطنی سے سنی ہیں، داؤدی نے صرف لحّان کہا ہے، جبکہ سہمی نے ایک جگہ دارقطنی کی زبانی یلح علی الخطأ بتایا ہے، داؤدی نے لایعرف من الفقہ لا قلیلاً ولا کثیراً کہا ہے، اور سہمی نے دارقطنی سے صرف کان لحّاناً ولا یعرف الفقہ کہا ہے، تفسیر کے

سلسلہ میں داؤدی نے دارقطنی کا قول نقل کیا ہے کہ فوائدہ قد نقل تفسیر ابی الجارود وفرقہ
فی الکتاب الخ اور سہمی کی روایت میں ہے فوائدہ قد نقل تفسیر ابی الجارود فی مواضع الخ
محدثین نے لکھا ہے کہ عقیلی، حاکم، ابن مردویہ، ابن جریر، دیلمی، ابن حبان کی طرح ابن شاہین
کی تصانیف میں بھی ضعیف احادیث موجود ہیں [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے احیاء و ایمان کی حدیث کو دارقطنی، جوزقانی،
ابن ناصر، ابن جوزی، ابن دحیہ نے موضوع بتایا ہے اور ابن شاہین، خطیب بغدادی، ابن عساکر،
سہیلی، قرطبی، محب طبری، ابن سید الناس نے اس کو صرف ضعیف کہا ہے، سیوطی نے کتاب التعظیم
والمنۃ میں لکھا ہے کہ پہلے گروہ نے اس کے ضعف کے جو علل بیان کیے ہیں، وہ سب کے سب غیر موثر
ہیں، اس لیے ہم دوسرے گروہ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں [2]

کتاب التفسیر الکبیر امام ابن شاہین نے مختصر طور سے اپنی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے کہا ہے
کہ میں نے تین سو تیس (۳۳۰) کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے التفسیر الکبیر ایک ہزار اجزاء میں ہے، اسی کو
سیوطی نے منتہی العقول میں لکھا ہے کہ ایک ہزار جلدوں میں ہے اور اسکا نام منتہی التفاسیر
لابن شاہین بتایا ہے [3] ذہبی نے لکھا ہے کہ ہمارے شیخ عماد الدین حزامی نے واسط میں مجھے
بتایا کہ تفسیر ابن شاہین تقریباً تیس جلدوں میں ہے [5]

کتاب المسند المسند ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) اجزاء میں ہے، کتب مسانید میں ہر صحابی کے ذکر میں اس کی
ساری مرویات جمع کر دی جاتی ہیں اور ہر ایک کے لیے مستقل باب قائم کیا جاتا ہے اور ان مرویات

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۲۶۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۸۴ [2] حاشیۃ الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۱۱۶
از شیخ عبد الفتاح ابو غدہ طبع حلب [3] الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۱۸۰ [4] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۷
[5] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۸۴۔

و احادیث کی صحت و غیر صحت سے بحث نہیں کی جاتی ہے، العبر، تذکرۃ الحفاظ اور شذرات الذہب میں
المسند کو تیرہ سو (۱۳۰۰) اجزاء میں بتایا ہے۔

کتاب التاریخ یہ کتاب ڈیڑھ سو اجزاء میں ہے، ابن شاہین نے یہ کتاب صحابہ اور تابعین کے
حالات میں لکھی ہے، حافظ ابن حجر نے الاصابۃ کے مقدمہ میں صحابہ و تابعین کے حالات میں کتابیں
لکھنے والوں کے تیسرے طبقہ میں ابو علی بن سکن، ابو حفص بن شاہین، ابو منصور باوردی،
ابو حاتم بن حبان اور طبرانی کو شمار کیا ہے [1] اور الاصابۃ میں بار بار ابن شاہین کی کتاب کا
حوالہ دیا ہے، مثلاً الاعوس بن عمرو الشکری کے حال میں لکھتے ہیں قلت وجدتہ فی کتاب
ابن شاہین الاعوس بالواو [2] اماناہ بن قیس کندی کے ذکر میں لکھا ہے وذکرہ ایضاً
الطبری وابن شاہین فی الصحابۃ [3] انس بن مدرک خثعمی کے حال میں لکھا ہے ذکرہ
ابن شاہین فی الصحابۃ [4] نیز ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ابن شاہین کی تاریخ
سے اخذ و نقل کیا، مثلاً یزید بن ضمیرہ مزنی حمصی کے ذکر میں لکھا ہے؛ قلت ذکرہ ابن
شاہین فی الصحابۃ وقال مات فی خلافۃ معاویۃ [5] عبد العزیز بن عبد اللہ بن
خالد بن اسید اموی کے حال میں لکھا ہے وذکرہ ابن شاہین فی الصحابۃ من اجل
حدیث ارسلہ [6]

کتاب الزہد یہ کتاب ایک سو (۱۰۰) اجزاء میں ہے، اکثر مشایخ محدثین نے زہد و رقائق کے موضوع
پر کتابیں لکھی ہیں، ابن شاہین بقیۃ الشیوخ اور واعظ تھے، زہد و تصوف کا ستھرا ذوق
رکھتے تھے، کتاب الزہد میں ترغیب و ترہیب کا بیان تھا۔

[1] الاصابۃ فی تمییز الصحابہ ج ۱، ص ۲ [2] الاصابہ ج ۱ ص ۵۴ [3] ایضاً ص ۶۳ [4] ایضاً ص ۷۳
[5] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۴۴ [6] ایضاً ج ۶ ص ۳۴۳۔

کتاب الترغیب | شیخ شمس الدین داؤدی نے طبقات المفسرین میں ابن شاہین کی تصانیف میں کتاب الترغیب کا ذکر کیا ہے، ہوسکتا ہے کہ کتاب الزہد ہی کتاب الترغیب ہو۔

کتاب السنۃ | کتانی نے الرسالۃ المستطرفۃ میں لکھا ہے کہ ابن شاہین صاحب تصانیف عجیبہ محدث ہیں، انھوں نے احمد بن حنبل، ابوبکر الاثرم، عبداللہ بن احمد بن حنبل کی طرح کتاب السنۃ لکھی ہے جس میں اتباع سنت اور اجتناب بدعت کا بیان ہے۔

کتاب تاریخ اسماء الثقات | اس کتاب کا پورا نام تاریخ اسماء الثقات ممن نقل عنہم العلم علی حروف المعجم ہے، کشف الظنون میں اس کے مصنف کا نام خلیل بن شاہین لکھا ہے[1] اور شیخ عبدالعزیز خولی مصری مرحوم نے مفتاح السنۃ میں کشف الظنون کی طرح خلیل بن شاہین لکھا ہے[2] مگر یہ صحیح نہیں ہے، خلیل بن شاہین ظاہری نویں صدی کے عالم تھے ان کی ایک کتاب جغرافیہ میں "کشف الممالک وبیان الطرق والمسالک" مدت ہوئی پیرس میں طبع ہوئی ہے[3]۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابن شاہین کی کتاب اسماء الثقات کا تذکرہ نہیں ملتا ہے، جب ثقات عجلی اور ثقات ابن حبان کا نام کتابوں میں عام طور سے آتا ہے، البتہ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں ثقات ابن شاہین کا تذکرہ کیا ہے، اور اس کی عبارتیں نقل کی ہیں اس کا قلمی نسخہ مکتوبہ سنہ ۱۱۴۳ھ دستیاب ہوا ہے جس سے راقم نے پوری کتاب نقل کرلی ہے۔

کتاب الضعفاء | امام ابن شاہین نے کتاب الثقات کی طرح کتاب الضعفاء بھی لکھی تھی اس کا نام ہم کو صرف ابن حجر کی کتاب تہذیب التہذیب میں (ابوالہیثم خالد بن الیاس دوری مدنی کے ذکر میں) مل سکا ہے ابن حجر نے لکھا ہے:

---

[1] کشف الظنون ج۱ ص ۵۲۱۔ [2] مفتاح السنۃ ص ۱۵۲ [3] التحقیقات المعدۃ بحتمیۃ ضم جیم جدۃ، ص ۷۵، از استاذ عبدالقدوس انصاری۔

وقال ابن شاہین فی الضعفاء ضعفہ محمد بن عمار (ج۳، ص ۸۱)	ابن شاہین نے کتاب الضعفاء میں کہا ہے کہ خالد بن الیاس کو محمد بن عمار نے ضعیف بتایا ہے۔

کتاب الجنائز | ابن شاہین کی تصانیف میں کتاب الجنائز بھی ہے جس کا تذکرہ مولانا عبدالرحمن محدث مبارکپوریؒ نے اپنی کتاب الجنائز (اردو) کے مقدمہ میں ابن شاہین کے حال میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ محدث ابن شاہین نے کتاب الجنائز کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی، آپ کی کتاب کی نسبت حافظ زیلعی نصب الرایہ میں لکھتے ہیں "جلد وسط" یعنی اوسط درجہ کے حجم کی کتاب ہے، نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی، حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں ابن شاہین کی کتاب الجنائز سے متعدد حدیثیں نقل کی ہیں[1]۔

کتاب ناسخ الحدیث ومنسوخہ | نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ نے التاج المکلل میں ابن شاہین کا نہایت مختصر تذکرہ کیا ہے جس میں ان دو تصانیف کی نشاندہی کی ہے، چنانچہ ایک کتاب ناسخ الحدیث ومنسوخہ کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ اس کا اختصار ابراہیم بن علی المعروف بابن عبدالحق نے کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت طویل تھی۔ (ص ۳۱۲)

کتاب جزء فی الحدیث | اس نام کی دوسری کتاب کا تذکرہ التاج المکلل میں ہے (ص ایضاً)

ابن شاہین کی تین سو تیس تصنیفات میں سے دس گیارہ کتابوں کے نام مل سکے ہیں، اور ان میں صرف ایک کتاب تاریخ اسماء الثقات کا قلمی نسخہ دستیاب ہوسکا ہے، جو نادر ونایاب ہے، ان شاء اللہ ہم اس پر ایک مستقل تعارفی مضمون لکھیں گے۔

وفات | امام ابن شاہین کی وفات یکشنبہ ذوالحجہ ۳۸۵ھ میں ہوئی، حافظ ابونعیم نے ۱۱ ذوالحجہ،

---

[1] کتاب الجنائز ص ۳ و ۴۔

اور عتیقی، ور ازجی نے ۱۲ رذوالحجہ بتایا ہے، بغداد کے باب حرب کے قبرستان میں امام احمد بن حنبلؒ کے پہلو میں دفن کیے گئے[۱]۔ المنتظم میں الحادی والعشرین یعنی ۲۱ رہے جو غالباً الحادی عشر یعنی ۱۱ رکی تصحیف ہے[۲]۔

اولاد امام ابن شاہین کے دو صاحبزادوں کا حال معلوم ہوسکا جو اپنے والد کی طرح ابن شاہین کی کنیت ولقب سے مشہور تھے اور اپنے زمانہ کے مشہور علماء و محدثین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

ابوطاہر احمد بن عمر بن شاہین ابوطاہر احمد بن عمر بن احمد بن عثمان، ابن شاہین کے لقب سے مشہور تھے انھوں نے حدیث کا سماع ابوعبداللہ بن مخرم، ابوسعید احمد بن محمد بن رمیح نسوی، ابوعلی بن صفوان، ابوبکر بن خلاد، ابوسلیمان محمد بن حسین حرانی، ابوبکر بن کوثر بربہاری سے کیا تھا، اور ان سے ابوالعز طناجیری نے روایت کی ہے، اور طناجیری سے خطیب نے روایت کی ہے، ثقہ محدث تھے، ابوالقاسم ازہری اور ابوالقاسم تنوخی کے بیان کے مطابق ابوطاہر احمد بن عمر بن شاہین جمعہ ۲۹ ربیع الاول ۴۰۶ھ میں فوت ہوئے[۳]۔

ابوالقاسم عبداللہ بن عمر بن احمد ابن شاہین الواعظ عبیداللہ بن عمر بن احمد بن عثمان، ابوالقاسم الواعظ المعروف بابن شاہین کی ولادت ۳۵۱ھ میں ہوئی، انھوں نے حدیث کا سماع اپنے والد ابن شاہین کے علاوہ ابن مالک قطیعی، ابومحمد بن ماسی، ابوبکر محمد بن حسن بربہاری، حسینک نیساپوری، محمد بن مظفر سے کیا تھا، خطیب نے براہ راست ان سے روایت کی ہے، صدوق محدث تھے، والد کی طرح وعظ گوئی میں مشہور تھے، اور آبائی مکان میں جو مشرقی بغداد کے میدان کے ایک جانب واقع تھا رہتے تھے، ان کی وفات پنجشنبہ ۴ ربیع الاول ۴۴۰ھ میں ہوئی اور دوسرے دن باب حرب کے قبرستان میں دفن کیے گئے[۴]۔

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸ [۲] المنتظم ج ۷، ص ۱۸۳ [۳] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۹۳ [۴] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۸۶۔ المنتظم ج ۸، ص ۳۸۔

چند ادیبوں کے خطوط

از

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، گورنمنٹ کالج، لاہور

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا، کسی نہ کسی بہانے وقت کے مشہور ادبا کو خط لکھنا، اور ان سے جواب کا طالب ہونا کچھ عرصہ اپنا ایک مشغلہ رہا، اس ضمن میں راقم نے جو ادبی نکتے یا سوال اٹھائے اور اُن کے جو جوابات پائے انھیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، ایک خط اس عنوان سے غیر متعلق ہے لیکن چونکہ ایک اہم شخصیت کا لکھا ہوا ہے، اور راقم کے بجائے اس کے ایک عزیز دوست کے نام ہے، اس لئے اسے ضمیمہ کے طور پر اس میں شامل کیا گیا ہے تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائے،

غالب کا مشہور شعر ہے:-

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے ‌ ‌ ‌ اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اس شعر میں لفظ آئے "ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا، جب ادھر ادھر دوستوں سے بحث کے بعد کوئی تسلی بخش بات نہ بن سکی، تو چند اہل قلم حضرات کو اس سلسلے میں زحمت دی، انھوں نے جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے،:-

کرم گستر۔ وعلیکم السلام:- مولانا عبدالماجد دریابادی (مرحوم ومغفور) نے ۲۸ رجولائی ۱۹۵۴ء کو تحریر فرمایا:- "آئے" دیوان غالب کے صرف چند پرانے نسخوں میں ہے،

باقی ایڈیشنوں میں برابر "آئی" ہی درج ہے،

شارحین میں سے طباطبائی، حسرت، آسی، کم از کم ان تینوں میں سے کسی نے اس فرق پر توجہ نہیں کی ہے،

"آئے" اور "آئی" میں خفیف فرق صرف املا اور تلفظ کا ہے معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ غالب کے وقت تک بول چال کی زبان میں تلفظاً "آئے" ہی (ئے "کی ہلکی آواز کے ساتھ) جائز تھا اور مصرع کا وزن اس کا مقتضی تھا، اب "آئے" (پوری آواز کے ساتھ) صرف بطور "آئی" افعال کی جمع کے لئے جائز ہے،

والسلام عبدالماجد

(اخبار صدق، دریاباد ضلع بارہ بنکی)

نیاز فتحپوری (مرحوم) مدیر مجلہ نگار لکھنؤ نے ۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو لکھا،

تسلیم — غالب نے "شامت آئی" لکھا ہے، "آئے" کا کوئی محل نہیں "آئی" کو "آ ای" نہیں پڑھا جائے گا، بلکہ آی (ہمزہ حذف کر کے) نیاز،

حضرت جعفر علی اثر (مرحوم و مغفور) نے کشمیری محلہ۔ لکھنؤ سے ۱۳ر اگست ۱۹۵۴ء کو لکھا:۔

مکرم بندہ۔ وعلیکم السلام، آپ کا پوسٹ کارڈ ملا، غالب کے شعر گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، الخ، میں "آئے" (یائے مجہول) سے ہے، نہ کہ آئی (یائے معروف) سے۔ اگر شامت آئی پڑھیں تو قدم لینا ہی شامت آنا ہو جاتا ہے، جو شاعر کا مقصود نہیں، اور حقیقت کے بھی خلاف ہے، شامت کہنے سے پاسبان کے قدم لینے اور اس کی منت سماجت کرنے کے بعد (کہ حضور یار میں جانے دے) جو

نتیجہ مترتب ہوا، اس کی طرف اشارہ ہوا، شامت پڑھنے سے شعر غلط اور بے معنی ہو جاتا ہے،"

خاکسار اثر لکھنوی

مسلم ٹاؤن لاہور سے ۲۳ر جولائی ۵۴ء کو مرحوم عبدالمجید سالک نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:

"مکرمی۔ السلام علیکم:- کارڈ ملا۔ "گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے" میں لفظ "آئے" ہی صحیح ہے، "آئی" صحیح نہیں ہے۔ ایک تو "آئی" لکھنے سے مصرع میں عروضی نقص پیدا ہو جاتا ہے، جو آئے سے پیدا نہیں ہوتا، دوسرے محاورہ اہل زبان یہی ہے جو مرزا صاحب نے لکھا ہے، آپ نے پوچھا ہے کہ "آئے" میں کیا خوبی ہے اس میں خوبی وغیرہ کا کوئی سوال نہیں، محاورے کا معاملہ ہے کل کو آپ پوچھ بیٹھیں گے کہ قدم لئے میں کونسی خوبی ہے، قدم پکڑنا یا قدم چومنا ہونا چاہئے تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ محاورۂ اہل زبان، ایسے موقع پر قدم لینا ہی ہے،

"شامت آئے" بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں، والسلام

عبدالمجید سالک،

محترم جناب ڈاکٹر سید عبداللہ ان دنوں لاہور سے باہر تشریف فرما تھے، انھیں میرا خط لاہور سے ہوتا ہوا ملا، (واضح ہو کہ راقم نے یہ تمام خطوط پشاور سے لکھے تھے،) اس کے باوجود انھوں نے جواب سے بہت اجلد ممنون فرمایا، ملاحظہ ہو:

"مانسہرہ۔ ضلع ہزارہ - ۲۵ر جولائی ۵۴ء

محترم۔ سلام مسنون۔ آپ کا خط لاہور سے ہو کر یہاں آیا، میرے خیال میں

مذکورہ شعر میں آئے سے " آئی " بہتر ہے، کیوں ؟ اس لئے کہ محبوب مجھے گدا سمجھ کر پہلے چپ تھا مگر میری جو شامت آئی تو میں نے پاسبان کے قدم لے لئے" اس سے وعید سمجھا کر یہ تو گدا نہیں سودائی ہے، پھر جو ہوا اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں، ؟

اس شعر میں ایک واقعہ کا ذکر ہے معمول کا ذکر نہیں، اگر معمول یا عادت کا ذکر ہوتا، تو شاید آئے کی گنجائش نکل آتی یعنی وہ گدا سمجھ کر چپ رہتا ہے، مگر میری جب شامت آئے (یعنی آتی ہے تو میں ......"

میں لاہور سے دور ہوں ورنہ اور نسخوں کو بھی دیکھ لیتا، میری رائے میں آئی ٹھیک اور آئے غلط ہے، والسلام، خاکسار سید عابد اللہ

جناب مولانا حامد علی خاں حامد (مدیر الحمرا) نے بھی خطاب کے بغیر اس طرح جواب سے نوازا

"غالب کے تمام اچھے ایڈیشنوں میں یہ شعر اسی طرح ہے، جیسا آپ نے لکھا (یعنی جو ایڈیشن میری نظر سے گذرے ہیں،) علاوہ ازیں آزاد نے آب حیات میں اور حالی نے یادگار غالب میں اسی طرح لکھا ہے، یہی میرے خیال میں بہتر بھی ہے، اہل پنجاب شاید آسانی سے اس انداز بیان کی خوبی نہیں سمجھ سکتے، اس میں بات کے "تیور" کا فرق ہے، جو لطف "مری جو شامت آئے" میں ہے، وہ "شامت آئی" میں نہیں ہے، خدا جانے پنجابی میں یوں کہہ سکتے ہیں یا نہیں "میری جو شامت آوے میں او توں بھرا آیا، مطلب اس دن واہ میرا گھر آ ای نہیں چھڈ دا" اگر پنجابی میں یہ کہہ سکتے ہیں تو آوے کی جگہ آ گئی "لکھ کر دیکھئے، آدھا لطف رہ جائے گا، "حامد"

مرحوم عابد علی عابد کو خدا معلوم میرا خط کیوں نہ ملا، میں نے حصول جواب کی خاطر

نہیں دو ایک مرتبہ بعد میں بھی لکھا، بہرحال کوئی ڈو برس بعد ان کا جواب مل تو گیا لیکن " مجھ پر احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا،" والی بات ہوئی (خدا ئے بزرگ و برتر ان کی مغفرت فرمائے،) ان دنوں وہ ہفت روزہ صادق نکال رہے تھے، انھوں نے شعر پر بحث کرنے کی بجائے اس کی شرح وقت پر شائع کرنے کا وعدہ فرمایا، وہ شرح شائع ہوئی یا نہیں، اس کا راقم کو علم نہیں، (۱۱-۱۲-۱۹۵۶ء) ہفت روزہ صادق

وائی ایم سی اے بلڈنگ، دی مال لاہور۔

مکرمی ۔ آپ کا خط مل گیا، ہے، میرا پتہ نکلسن روڈ، لاہور ہے، معلوم نہیں آپ کے پہلے خط کیوں نہیں ملے، غالب کا شعر جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کی شرح وقت پر "صادق" میں شائع ہوگی، وہیں ملاحظہ فرما لیجئے گا،

ہمارے ہاں خط کا جواب ضرور دیا جاتا ہے، اس لئے آپ کا جوابی کارڈ استعمال نہیں کیا گیا،

فقط "مخلص عابد علی"

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ایک معمولی سے لفظ نے ارباب فکر و دانش کے ذہنوں کے چمن میں کیا کیا گل کھلائے، ؟ بہرحال اس ادبی رائے شماری میں جیسا کہ آپ نے دیکھا، لفظ "آئے" کا پلڑا بھاری رہا ہے، محترم مولانا حامد علی خاں حامد نے تو دو مستند حوالوں سے اپنی رائے کو مزید ٹھوس بنا دیا ہے، خوش خطی کے لحاظ سے مرحوم آتش لکھنوی کا خط بڑا اچھا اور پیارا ہے، الفاظ کی نوک پلک اپنی جگہ پر درست ہے، ان کے بعد مرحومین سالک و عابد کا نمبر آتا ہے، البتہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے خط کی شکستگی اور یائے معروف کے نیچے دو فالتو نقطوں (کی ۔ کسی ۔ آئی)، کے سبب مکتوب الیہ کو آنکھوں اور ذہن پر کسی قدر بوجھ ڈال کر ان کا خط (یعنی تحریر) پڑھنا پڑتا ہے، سالک مرحوم نے نامکمل فقروں کے آگے مکمل فقرے کی علامت لگائی ہے، جس کا مطلب ہے، وہ علامت گذاری

کے معاملے میں اتنے محتاط نہ تھے،

غالباً ۱۹۵۶ء میں فیروز سنز لاہور والوں نے تذکرۂ شعرائے جدید شائع کیا، سرسری مطالعہ کے دوران میں ایک شعر پر نظر پڑی، جسے تذکرہ نگار نے ریاض خیرآبادی سے منسوب کیا تھا، لیکن راقم نے اسے کسی مضمون میں گستاخ رامپوری سے منسوب پایا تھا چنانچہ فوراً رگ جواب طلبی پھڑکی اور راقم نے نیاز فتحپوری کا مرحوم کو خط لکھ ڈالا، ۲۰؍اپریل ۱۹۵۶ء کو لکھنو سے ان کا حسب سابق دوسطری جواب ملا،

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی،

لکھنو ۲۰؍اپریل ۱۹۵۶ء

"یہ شعر یقیناً گستاخ کا ہے، کسی غلطی کی وجہ سے ریاض سے منسوب ہو گیا، نیاز

مذکورہ ادارے کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو یہ جواب موصول ہوا :۔

"فیروز سنز لاہور

"کارڈ محررہ ۲۲؍اپریل موصول ہوا، آپ نے جس شعر کا حوالہ دیا ہے، بادہ سے ریاض رضوان کے نہ ملنے سے اس کی تصدیق تو نہیں ہو سکی، کہ وہ ان کے دیوان میں بھی ہے یا نہیں لیکن ایک دوست کی بیاض سے معلوم ہوا ہے، کہ یہ گستاخ دہلوی کا شعر ہے، دہلوی اور رامپوری کا تو قضیہ (؟ غالباً یہی لفظ ہے) نہیں۔ اگر آپ کے پاس ریاض رضوان ہو تو اس سے دیکھ کر بتا دیں کہ یہ شعر ریاض کا ہے، یا نہیں تاکہ اگر نہ ہو تو آئندہ ایڈیشن میں نکال دیا جائے، ہم بھی کوشش کر رہے ہیں، اگر ریاض مرحوم کی متذکرہ کتاب مل گئی تو اس شبہہ کو دور کرنے کی کوشش کی جائیگی،

آپ کی اس عنایت کا شکریہ،

جوابی کارڈ لکھکر آپ نے تکلف سے ہی کام لیا ہے، ؟ نیاز کیش، اقبال احمد ۲۰ اپریل

راقم کے پاس مذکورہ کتاب تھی، چنانچہ فوراً اس سے انھیں آگاہ کر دیا گیا اور پھر وہی معاملہ ہوا یعنی :۔

ع :۔ آن را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

جعفر علی اثر مرحوم خود کو "میری" کہا کرتے تھے، ایک مرتبہ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا میر تقی میر پر ایک مضمون ماہنامہ ادب لطیف لاہور کے کسی شمارے میں شائع ہوا، اس میں میر کا ایک مصرع یوں درج تھا :۔ طالع نے چشم پوشی یہاں تک کی ہمنشیں

اثر مرحوم نے اس مضمون کے جواب میں ایک مضمون لکھا، یہ مضمون اب صحیح طور پر یاد نہیں کہ ادب لطیف ہی میں شائع ہوا، یا ماہنامہ الحمراء لاہور میں، بہر حال اس مضمون میں یہ مصرعہ اس طرح درج تھا، جب کہ کلیات میر مرتبہ آسی میں ذرا سے فرق کے ساتھ ہے، راقم کو بہانہ ہاتھ آیا، اثر مرحوم کو لکھا کہ میر پر آپ کا جواب مضمون "پڑھا، تعجب ہوا کہ آپ ایسے "میری" بھی میر کا شعر غلط لکھیں، ؟ اس کے ساتھ ہی ان کی تصانیف کے بارے میں بھی ایک سوال لکھ ڈالا"

مرحوم نے کمال عنایت سے یہ جواب تحریر فرمایا :

کشمیری محلہ۔ لکھنو، ۲۸؍اکتوبر ۱۹۵۲ء

مکرمی۔ تسلیم :۔ خط کا شکریہ، ادب لطیف کا وہ نمبر اس وقت نہیں ملتا، جس میں جناب پروفیسر سید عبداللہ کا مضمون شائع ہوا ہے، اور میرا مضمون جس کا جواب ہے، انھوں نے غالباً میر کا مصرع یونہی درج کیا ہے :

ع : طالع نے چشم پوشی یہاں تک کی ہمنشیں،

میں نے اس طرف توجہ نہیں کی، کہ اس کے الفاظ میں کچھ رد و بدل ہے آپ کی

تحریر ملنے پر کلیات میر میں دیکھا تو مصرع اسی طرح درج ہے، جس طرح آپ نے تحریر
فرمایا ہے، اگر میں نے پروفیسر صاحب کا تتبع کیا ہے، تو پہلے اُن سے باز پرس کیجیے
ورنہ میں گنہگار رہوں،

"پچھان بین" کے علاوہ ایک اور مجموعہ اثر کے تنقیدی مضامین "شائع ہوا ہے"
دو دیوان ہیں "اثرستان اور بہاراں"، ایک مجموعہ رنگ بست ہے، جس میں
غیر زبانوں کے آزاد منظوم تراجم ہیں، نغمۂ جاوید گیتا کا منظوم ترجمہ - لالہ و گل
مجموعہ رباعیات و قطعات - اور بھی تصنیفات ہیں، آپ کا دماغ کہاں تک
پریشان کروں، "نیاز کیش اثر"

تیس برس قبل مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب "خطوط مشاہیر حصہ اول" (مطبوعہ
تاج کمپنی لاہور) میں مولانا کے نام حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کا یہ خط نظر سے گذرا تھا:

الہ آباد - ۸ ستمبر ۱۴ء

عزیزی و حبیبی سلمہ اللہ تعالی، ! مجھ کو حیرت ہوئی، کہ آپ ایسے شعر کہہ سکتے
ہیں[1]، جو رنگ سخن ظاہر ہوتا ہے، وہ بہت پختہ ہے، کیا کہنا چاہیے، اور کیونکر کہنا چاہیے
اول میں کوئی جگہ اعتراض کی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی تقلید مناسب ہے، دوم میں البتہ

[1] مولانا نے یہاں یہ حاشیہ دیا ہے "۱۴ء سے میرا دور غزل گوئی شروع ہوتا ہے جو شادی سے دو سال قبل شروع ہوا، اور شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد تک رہا۔ پہلی غزل: زاریاں ڈھ گئیں بیاریاں ڈھ گئیں کی زمین میں تھی، یہی غزل اصلاح کے لئے حضرت اکبر کی خدمت میں روانہ کی ہے، حالانکہ طبیعت پر رنگ حسرت موہانی کا غالب تھا،"

(خطوط مشاہیر ص ۷۱)

کہیں کہیں کچھ اصلاح کی ضرورت ہے، بہر کیف میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش
ہوا، یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے:

رہی ہر چند عقل صبر آموز ڈھ گئیں بے قراریاں ڈھ گئیں،

کیا خوب کہا ہے، آپ انشاء اللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے، دو دن
سے طبیعت اچھی نہیں، نزلے میں مبتلا ہوں، زیادہ نہ لکھ سکا،۔

دعاگو اکبر حسین

کبھی دل چاہے تو دو ایک دن کے لئے چلے آئیے، آپ تو طالب علمانہ حالت میں
ہیں اور میرے عزیز ہیں۔ سفر کا بل میرے ذمہ[1]،

یہ خط پڑھنے کے بعد راقم نے مولانا کو اُن کے مجموعۂ کلام کا نام پوچھنے کی خاطر خط لکھ ڈالا
جس کا انھوں نے از راہِ لطف و عنایت درج ذیل جواب دیا:

ہفتہ وار صدق لکھنؤ،

مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء   دریاباد ضلع بارہ بنکی (یو۔پی)

عزیزم - و علیکم السلام :- اپنی شاعری کی بساط ہی کیا، زندگی میں
کل دو دور شاعری کے آئے[2]، ایک آخر ۱۳ء سے ۱۶ء تک رہا، جب عمر ۲۱ تا ۲۴
تھی، وہ غزل کی شاعری تھی، اور ایک جائز عشق کا نتیجہ۔ - ایک ڈراما "ناظر" کے فرضی
نام سے ۱۵ء میں لکھا تھا، "زود پشیماں" کچھ غزلیں اس میں آگئی ہیں، اب کہاں ملیں گی،
دوسرا دور ۲۲ء سے ۲۴ء تک قائم رہا - اب ملحد نہیں، بلکہ از سر نو مسلمان
ہو چکا تھا، اس دور کی غزلیں نعتیہ ہیں، زیادہ تر مولانا محمد علی جوہر کے اتباع میں۔

[1] خطوط مشاہیر، حصہ اول ص ۷۰، ۷۱،

بس یہی کل کائنات شاعری کی ہے،

محوی صاحب کی کتاب اور مقدمہ نظر سے نہیں گذرا، بات کوئی ایسی اہم اور بحث طلب ہے بھی نہیں[۱]

سیحح پتہ لکھنؤ کا نہیں دریاباد کا ہے،

والسلام دعاگو

عبدالماجد

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے، (جس کا ایک مصرع ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے)

نوروز و نوبہار و مے و دلبرے خوش ست
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسے برصغیر میں مغلیہ خاندان کے بانی ظہیر الدین بابر سے منسوب کیا گیا ہے لیکن بعض محققین اسے کسی اور بابر کا بتاتے ہیں، راقم نے اس ضمن میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کے علمی و ادبی مجلہ کے مدیر محترم سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی رائے معلوم کرنے کے لئے انھیں خط لکھا، انھوں نے کمال مہربانی سے تفصیلی جواب ارسال فرمایا، ملاحظہ ہو،

۱۰ر جون ۸۲ء محترمی، تسلیم

نوازشنامہ ملا تھا، رمضان شریف اور دوسری مشغولیت کی وجہ سے جواب دینے میں تاخیر ہوئی، جس کے لئے معذرت کا خواہاں ہوں، حسب ذیل شعر

نوروز و نوبہار و مے و دلبری خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

---

[۱] حسن سجزی کی بحث کی طرف اشارہ ہے، [۲] مثلاً حسین دوست سنبھلی نے اپنی کتاب تذکرۂ حسینی (مطبوعہ نولکشور پریس ص ۶۴) میں اسے سلطان ابوالقاسم بابر میرزا ابن بایسنغر (بایسنغر) میرزا سے منسوب کیا، اور پہلا مصرع اس طرح دیا ہے، ع

نوروز و نوبہار و مے و دلبران خوش است

بابری کا شعر ہے، تاریخ فرشتہ (نولکشور پریس) کے جلد اول ص ۲۱۱ پر یہ شعر اسی کی طرف منسوب ہے، پروفیسر عبدالغنی نے اپنی کتاب پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ جلد اول (ص ۵۵) اور اس عاجز راقم نے اپنی حقیر تالیف بزم تیموریہ (ص ۱۸) میں اس شعر کو بابر ہی کا شعر قرار دیا ہے، تذکرہ حسینی بارہویں صدی ہجری یعنی ۱۱۶۳ھ میں لکھی گئی ہے اس لئے فرشتہ کا بیان اس کے مقابلہ میں زیادہ قابل ترجیح ہے،

حسین دوست سنبھلی ضلع مرادآباد (مرادآباد؟) (یو۔پی) کے رہنے والے تھے، ان کے والد بزرگوار کا نام سید ابوطالب تھا، وہ سنبھل سے دہلی آئے، اور یہاں رہ کر شعر و شاعری کا اچھا ذوق پیدا کیا، دوستوں کے اصرار سے ایک تذکرہ لکھا جس کا نام تذکرہ حسینی رکھا، اس میں زیادہ تر شعراء کا تذکرہ ہے، بعض اولیاء اور شہزادوں کا بھی ذکر آ گیا ہے، محققین اس تذکرہ کا حوالہ برابر دیتے رہے ہیں لیکن یہ تذکرہ اپنے عہد کے شعراء کے لئے تو مستند سمجھا جا سکتا ہے لیکن قدیم شعرا کے حالات کے لئے معاصر تذکروں ہی کے بیانات کو ترجیح دینا چاہئے۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ والسلام صباح الدین عبدالرحمٰن

مشہور ہے کہ زیب النساء دختر اورنگ زیب عالمگیر شاعرہ تھی، اور مخفی تخلص کرتی تھی، خیال ہے کہ اسی بنا پر برصغیر میں شائع شدہ ایک فارسی مجموعۂ کلام "دیوان مخفی" کو اس سے منسوب کیا گیا، لیکن چونکہ علامہ شبلی مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کی بیاض تالاب میں گر گئی تھی، اس لئے اس دیوان کا اس سے کہاں تک تعلق ہے، یہ مسئلہ زیر بحث تھا، اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی صاحب اور مدیر معارف اعظم گڈھ کو خطوط لکھے گئے، جوش صاحب کو لفظ "خضر" کے تلفظ کے بارے میں بھی پوچھا گیا تھا، جوش صاحب نے لکھا:

دہلی   ۱۱ر مارچ ۵۲ء

مکرمی،   دیوان مخفی کے متعلق میری کوئی تحقیقاتی رائے نہیں ہے،

"خضر" ایسا نام ہے جو "ض" کے سکون، فتح اور کسرہ تینوں طرح سے ملفوظ ہوتا ہے،

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے،   جوش

معین الدین احمد صاحب (معارف) سے یہ بھی پوچھا گیا تھا، کہ معارف کا پرچہ (جس کی فروخت بعض پابندیوں کے سبب یہاں محدود ہوکر رہ گئی تھی) لاہور میں اب کہاں سے دستیاب ہوسکتا ہے؛:

مکرمی   السلام علیکم

آپ کا خط ملا، معارف کے پرچے آپ کو مکتبہ جدید انارکلی لاہور (سے) مل جائیں گے۔ معارف کا خاص نمبر نہیں نکلا، دیوان مخفی زیب النساء کا نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے شاعر کا ہے، جو زیب النساء کی جانب منسوب ہوگیا ہے"

والسلام معین الدین احمد   ۲۴ر اکتوبر ۵۲ء

اس سے قبل اسی سال جولائی کے مہینے میں نیاز فتحپوری مرحوم کو کسی بات پر خط لکھا تھا جس میں مجلہ نگار سے متعلق کوئی تجویز بھی پیش کی گئی تھی، تجویز کیا تھی، کچھ یاد نہیں، بس کیا پدی کیا پدی کا شوربا" والی بات ہوگی، ظاہر ہے اس کا جواب کچھ کرارا ہی ہوگا، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ نیاز مرحوم نے جواب میں کس بھرپور طنز سے کام لیا ہے؛

دفتر نگار لکھنؤ۔   ۱۵ر جولائی ۵۲ء

مکرمی۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ سالنامہ کے متعلق آپ کی تجویز بہت

معقول ہے لیکن اس نامعقول دنیا میں معقول بات کون سنتا ہے، بہرحال آئندہ سالنامہ مرزا داغ کے لئے وقف ہوگا، یہ بات طے ہوچکی ہے،

خاکسار   نیاز فتحپوری

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے ایک دوست عرفان مرحوم تھے، جن کا تعلق صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ سے تھا، ان کا ایک بھتیجا راقم کا شاگرد تھا، ایک روز باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے اس دوستی اور مرحومین کی باہمی خط وکتابت کا تذکرہ کیا، اور یہ بھی بتایا کہ جوہر مرحوم کے کئی خطوط ان کے گھر موجود ہیں، میں نے اسے دکھانے کو کہا، ایک روز چھٹیوں کے بعد گاؤں سے وہ ایک پوسٹ کارڈ لے آیا، اور کہنے لگا کہ تلاش بسیار کے باوجود صرف یہی ایک کارڈ مل سکا ہے، باقی بے توجہی کی نذر ہوگئے ہیں، بڑا دکھ ہوا، تاہم اسے تبرک سمجھ کر بہت احتیاط سے رکھ لیا، اور آج فخر کے ساتھ اسے ہدیہ قارئین کر رہا ہوں،

پوسٹ کارڈ کے ایک جانب بعض عمارتوں کی رنگین تصویریں ہیں، اور نیچے انگریزی میں یہ عبارت چھپی ہے،

3 B. I. lines, Crater, Aden.

دوسری جانب وسط میں انگریزی حروف میں پوسٹ کارڈ لکھا ہے، اور دائیں جانب آخر میں چھوٹا سا چوکھٹا ہے جس میں

Printed in Germany

کی عبارت ہے، اس کے ساتھ ہی پتے کا حصہ ہے، درمیان میں اوپر سے نیچے ایک لکیر کھینچی گئی ہے جس میں یہ عبارت ہے؛:

This is a real Photograph

کارڈ کی اسی جانب جوہر مرحوم کی خوشخط اور ذرا موٹے قلم کی تحریر ہے، ملاحظہ ہو؛:-

"عرفان - ابھی عدن ہوکر آیا ہوں، ہندوستان کی غلامی کے لئے یہ بھی غلام ہے

جبل الطارق ہی سے ہندوستانی غلامی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، یہ آخری کڑی ہے،
خدا اس زنجیر کو جلد توڑے"۔

تمہارا محمد علی

عدن - ۷ر جون ۱۹۲۳ء

کارڈ پر کوئی ٹکٹ نہیں، غالباً یہ کارڈ کسی لفافے میں ڈال کر بھیجا گیا ہے، کیونکہ اس پر
عرفان مرحوم کا پتہ نہیں ہے،

اس خط سے اندازہ ہوگا کہ مولانا محمد علی کو اپنے وطن کی غلامی سے کیسا دکھ رہا، دور دراز علاقوں پر بھی ان کی نظر پڑتی تو ان کے دل میں ہوک اٹھتی کہ ان ہی راستوں کے ذریعہ سے ہندوستان کی گردن میں غلامی کا طوق پڑا،

مکاتیب شبلی

حصہ اول و دوم

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو جو خطوط لکھے تھے، دارالمصنفین نے ان کو دو جلدوں میں شائع کیا ہے، پہلی جلد اُن کے ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر و احباب کے نام کے خطوط پر مشتمل ہے، ان سے ان کے قومی خیالات، علمی و تعلیمی نظریات و افکار کے علاوہ ان کے عہد کے اسلامی ہندوستان کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں اور جد وجہد کا پورا مرقع بھی سامنے آجاتا ہے، یہ خطوط مولانا کی رعنائی قلم کے مظہر ہونے کے ساتھ بہت ہی دلچسپ اور ادبی و علمی نکات سے معمور ہیں،

مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی جلد اول، قیمت :-

جلد دوم، قیمت :-

"منیجر"

اسلام اور مستشرقین

پر

دارالمصنفین کا بین الاقوامی سمینار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۷)

سمینار کی پانچویں نشست رابطۂ اسلامیہ مکہ کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق کی صدارت میں شروع ہوئی، ان کی صدارت کی تحریک کرتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندوی نے ایک بار پھر فرمایا کہ رابطۂ اسلامیہ نے خاص طور سے ان کو اپنا نمایندہ بنا کر اس سمینار کے لیے بھیجا ہے، وہ بہت ہی مشغول آدمی ہیں، اس وقت یوگنڈا سے یہاں کی شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں، کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے انجام دیے، انھوں نے جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی، جس کا عنوان "مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر" تھا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اس مقالہ کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں :

مشرق کے خلاف یورپ کی جارحیت ہمہ جہت تھی، ان کے حملے صرف فوجوں کے ذریعہ نہیں ہوئے، اس میں ان کے دانشور مستشرقین، اہل فکر، شعراء اور اساتذہ بھی شامل تھے، اسی لیے

اقبالؒ نے مغربی مدرسوں کی کورنگاہی اور بے ذوقی کی شکایت کی ہے ع

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

مغربی اثرات کے چیلنج کا ردعمل مشرق پر ایک دائرہ کی شکل میں رونما ہوا، جس میں ردو قبول، تقلید و تخلیق، تنقیدی فکر اور بہترین اقدار کا انتخاب اور اعتماد کے ساتھ اپنی صالح مشرقیت پر جمے رہنے کا انداز کارفرما ہے، لیکن مغرب نے نئے دام بچھائے تھے، اور ایک ایسی نسل کو تیار کیا تھا جو اپنی ذہنیت اور مرعوبیت میں بالکل مغرب زدہ اور مشرق سے بیزار تھی، دراصل اہل کلیسا کا یہ نظام تعلیم اقبالؒ کے الفاظ میں ع

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں صراحت سے لکھا ہے کہ لندن میں مشرقی و افریقی علوم کا ادارہ صرف برطانوی سامراجیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے، اسی قسم کے خیالات انھوں نے حافظ فضل الرحمٰن انصاری کے نام ایک خط میں ظاہر کیے ہیں، لکھتے ہیں:

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاق حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے، سادہ لوح مسلمان طالب علم طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔"

(اقبال نامہ، ص ۳۹۲)

اقبالؒ کو افسوس تھا کہ مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں، ان کی نظر مساوات شکم سے آگے نہیں جاتی، وہ روح کو معدہ میں تلاش کرنا چاہتے ہیں حالانکہ روح کی قوت و حیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں، یہ اور اسی قسم کے بہت سے خیالات

ان مغربی دانشوروں کے ذریعہ پھیلے، جن کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیے بغیر ترقی ممکن نہیں تھی۔
جب اقوام مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا شروع کی تو اس کی ضرورت بھی محسوس کی کہ ان کی زبانوں کو، ان کے مذاہب کو اور ان کے تہذیب و تمدن کو سمجھیں اور ان کو اپنے رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃً اعلیٰ و ارفع نظر آئے اور ان کی صنعت و حرفت اور سامان تجارت بہتر ٹھہرے، جن عالموں نے اس اقلیم میں قدم رکھا وہ مستشرقین کہلائے اور پورا ایک نیا علم اورینٹلزم کے نام سے وجود میں آگیا، یہ مشرق اورینٹ (ایسٹ نہیں) اصل میں مغرب کا زائیدۂ فکر ہے، جہاں تخیل ہی تخیل ہے، رومانس ہی رومانس ہے، اس میں شدید جنسیت ہے، عیش و عشرت کی بہتات ہے، بھوک اور بے رحمی ہے، اس کی میزان قدر میں قرآن پاک اہم نہیں ہے، الف لیلہ اہم ہے، جو عربی ادبیات میں معمولی درجہ کی کتاب ہے، یہ مشرق، مغرب کی بنیادی تہذیب کا حصہ بن گیا ہے، اس میں عجیب و غریب آدمی رہتے ہیں، نیم وحشی، نیم متمدن، نیم برہنہ، خواجۂ سگ پرست بھی، نعمان سیاح بھی، زاہد بھی رند بھی، اس مشرق کی دولت بے کراں ہے، اس کی خام پیداوار کے بغیر مغرب کے کارخانے نہیں چل سکتے، یہ مشرق تہذیب کا گہوارہ اور مذاہب کا سرچشمہ ہے، یہ مشرق مغرب کے مادی مفادات کا مرکز و محور ہے، اس مشرق کو یورپ نے سماجیاتی، فوجی، جنگی اور سیاسی طور پر پیدا کیا ہے، اور اس پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے، اس مشرق کا جو کلیۃً مغربی تصورات اور مفادات کی پیداوار ہے، کچھ تھوڑا سا اندازہ دانتے کی مشہور و معروف نظم طربیۂ خداوندی سے ہو سکتا ہے، جو ۱۳۱۴ء اور ۱۳۲۱ء کے درمیان تصنیف ہوئی، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اہل یورپ مشرق بالخصوص اسلام کے متعلق کیسے گھناؤنے تصورات رکھتے تھے، اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ عشق محمدؐ ان کے دل سے

نکال دیں، اس لیے کہ اسی پر ان کی عظمت قائم تھی، اس نظم نے یورپ کے ذہن وضمیر پر بے انتہا اثر ڈالا ہے اور اتنے ماہ وسال گذرنے کے بعد اس میں تاریخ کی سی تقدیس اور سچائی پیدا ہوگئی ہے طربیۂ خداوندی کے تین حصے ہیں، دوزخ، برزخ اور فردوس، دانتے مشرق ومغرب کی اہم شخصیتوں سے واقف تھا، مثلاً وہ ورجل، ہومر، ابن سینا اور ابن رشد سے واقف ہے، اور مسلمانوں اور یہودیوں کی تاریخ سے بھی ناآشنا نہیں تھا، اس میں عیسائیوں کی کور نگہی، تنگ دلی اور عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اس کا یہ ایمان ہے کہ مغفرت کے سزاوار صرف کیتھولک عیسائی اور باقی سب دوزخ کا کندہ ہیں، دانتے نے دوزخ کے کینٹو اٹھائیس[28] اور نویں طبقہ جہنم یعنی اقلیم عذاب میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ بڑی ہی ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے، نقل کفر کفر نہ باشد، یہ دکھلایا ہے کہ شکم مبارک چاک ہے اور حضور سرور کائنات کی نعوذ باللہ آنتیں باہر لٹکی ہوئی ہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جن کو خود نعوذ باللہ دو حصوں میں چیر دیا گیا ہے فرماتے ہیں: دیکھو میری یہ حالت سیاہ ترین بدمستیوں اور بدکاریوں کا نتیجہ ہے، یہ عیسائیت کو مسخ کرنے، فریب اور ریاکاری اور نفاق کو پھیلانے اور اختلات کا بیج بونے کی سزا ہے، استغفر اللہ دانتے کو پاپائیت اور کیتھولک فلسفہ اور عقیدے پر پورا یقین تھا، اور اس کے تخیل کے سارے نقش ونگار اسی مذہبی تعصب کے پیدا کردہ ہیں، طربیۂ خداوندی کی تعمیر وترکیب میں بھی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایتوں، تمثیلوں اور یونانی، رومی اور عرب صنمیات کے علاوہ سب سے زیادہ دخل اس تعصب کو ہے جو صلیبی جنگوں سے عیسائیوں کے دلوں میں جاگزیں تھا، اور اس میں سب سے بڑی کرشمہ سازی اس زہریلے تخیل کی ہے جو دانتے کی شاعری کا حصہ بن گیا تھا، اس کا اتنا گہرا اثر مغرب پر ہوا ہے کہ انھوں نے طربیۂ خداوندی کو صحیفۂ آسمانی شمار کر لیا تھا۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دانتے سے لے کر ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور اور بیسویں صدی کے منٹ گمری واٹ تک اسلام کا کم وبیش یہی تصور ان کے سامنے رہا ہے، اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسر آئے وہ بھی یہی تخیل رکھتے تھے، اور وہ عیسائیت کی سب سے بڑی خدمت یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنائیں، ان کی عظمت دیرینہ کو ختم کر دیں اور ان کے دل سے حضور رسالت مآب کی محبت نکال دیں، وہ خوب جانتے تھے کہ اس محبت کے بغیر اسلام کی عمارت ڈھ جائے گی،

۱۸۴۱ء سے ۱۸۵۷ء کے درمیان مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو مناظرے پہلے آگرہ اور پھر دہلی میں ہوئے ان میں بھی یہی تخیل اور یہی تعصب کار فرما ہے، ۱۸۰۳ء میں عیسائیوں نے دہلی میں قدم جمائے اور ۱۸۰۳ء ہی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ ہگلی سے لے کر دہلی تک سارا علاقہ انگریزوں کے زیر اثر آگیا ہے، اس لیے ان کے خلاف لڑنا ہمارا دینی فرض ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں ان کے نئے علوم کو بھی سیکھنا چاہیے، ۱۸۴۲ء اور ۱۸۵۴ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں اور ریورنڈ فینڈر کے درمیان آگرہ میں جو مذہبی بحثیں اور مناظرے ہوئے ان سے بھی عیسائیوں کی یہی کور فہمی، تنگ نظری اور عصبیت جھلکتی ہے جو صلیبی جنگوں اور دانتے کی بدولت ان کو وراثۃً ملی تھی، سرسیدؒ کا یہ خیال صحیح ہے کہ اسی کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علماء نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالی تھی۔

۱۸۳۳ء میں جو چارٹر ایکٹ آیا، اس نے بھی مسیحی مبلغین کو بالکل بے لگام کر دیا تھا، اور انھوں نے مسلمانوں کی دل شکنی اور دل آزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس کی شہادت ڈپٹی نذیر احمد اور سرسیدؒ کی تحریروں سے بخوبی مل جاتی ہے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مشرق کے زوال اور مغربی استحصال کے ساتھ ساتھ اسلام

اور اسلامی ممالک کی غلط تعبیر کے لیے ایک نیا ڈسپلن وجود میں آیا جس کو اورینٹلزم کہا جاتا ہے، میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اس شر میں خیر بھی شامل تھا، اس سے بالواسطہ تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلیں اور سماجی اور سائنسی علوم کی مدد سے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ خزینہ دار اور تونگر بن گئیں، لیکن انیسویں صدی کے اواخر تک یہ کوشش صرف جھوٹی سچی ملی ہوئی افواہوں اور افسانہ طرازیوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مجموعہ تھی جس کے پیچھے سامراجی مقاصد تھے، ان مقاصد پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے اور عام طالب علم ان پردوں کے نقش ونگار ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے، ڈاکٹر اسپرنگر کی کتابیں بزبان انگریزی و جرمن اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، اس نے انگریزی میں لائف آف محمد کے نام سے لکھی جو الہ آباد سے ۱۸۵۱ء میں شایع ہوئی، پھر جرمن زبان میں لائف اینڈ ڈاکٹرینز آف محمد کے نام سے تین جلدیں لکھیں جو ۱۸۶۹ء میں شایع ہوئیں، اسپرنگر کا ماخذ واقدی ہے جس کے متعلق تمام دنیا یہ جانتی ہے کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا اور اس کی غلط روایتوں، افسانہ طرازیوں اور جھوٹے قصے کہانیوں اور بے سند باتوں کی وجہ سے تمام علمائے اسلام نے غلط اور نامعتبر قرار دیا ہے، یہی حال سرولیم میور کا ہے جن کے اعتراضات سے سرسید کا کلیجہ چھلنی ہوگیا تھا اور اسی کا جواب لکھنے کے لیے وہ انگلستان گئے اور اس کا جواب انھوں نے خطبات احمدیہ کے نام سے ۱۸۷۰ء میں اپنے برتن بیچ بیچ کر لندن سے شایع کیا...... سرولیم میور نے حضور رسالت مآبؐ کی شان میں...... وہ تمام رکیک اور بیہودہ الفاظ استعمال کیے ہیں جو اس سے قبل صلیبی جنگ اور دانتے کے ذریعہ رائج ہوچکے تھے...... کارلائل اور گبن کے یہاں چند اچھے کلمات مل جاتے ہیں، لیکن ان کی استثنائی حیثیت ہے اور صحیح معنوں میں وہ مستشرق نہیں ہیں، انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل تک حضور رسالت مآبؐ اور اسلام کو بھی تعصب سے جانچا گیا اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرکے

اسکولوں اور کالجوں میں پیش کیا گیا، عیسائیوں نے مسلمانوں کی عظمت دیرینہ اور تہذیبی برتری پر کاری ضرب لگائی، اس لیے کہ بقول اسپرنگر جو قدیم دہلی کالج کا پرنسپل تھا اسی عظمت کے احساس نے ان کو لکھنؤ اور دہلی کی مدافعت میں جو ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں عمل میں آئی ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا کردیا تھا کہ موت سے آنکھیں ملاسکیں اور بے پناہ اور ناقابل تسخیر بن جائیں...... بیسویں صدی میں عیسائیوں کے ضمیر نے ایک نئی کروٹ لی ہے، یا یہ پرانے شکاری ایک نیا جال لائے ہیں، یا تیل کی اہمیت کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے کچھ نرم کرنا چاہتے ہیں، بہرحال اسی وجہ سے علم کی خاطر کم اور سیاست کی وجہ سے زیادہ ووڈبروک کالج سیلی اوک نے کرسچین مسلم ڈائیلاگ شروع کیا ہے، اس سے امید بندھتی ہے کہ تعصب کے پردے چاک ہوں گے، مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی کوشش سے ایک صحیح تصویر ابھرے گی۔

جناب سید اطہر حسین صاحب

اس مقالہ کے بعد جناب سید اطہر حسین صاحب آئی. اے. ایس کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی زحمت دی گئی، وہ اترپردیش کی حکومت میں اعلیٰ ترین عہدوں پر رہ چکے ہیں، اردو اور انگریزی میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، قرآن مجید اور حدیث پر ان کی اچھی نظر ہے، جس موضوع پر چاہتے ہیں بڑی بے تکلفی اور آسانی سے انگریزی اور اردو میں چھوٹے بڑے رسالے قلمبند کرلیتے ہیں، شاعر بھی ہیں، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے معزز رکن بھی ہیں، ان کے مقالہ کا موضوع "قرآن اور مستشرقین" تھا، انگریزی اور اردو دونوں میں ان کا یہ مقالہ تھا، انگریزی میں ان کا یہ مقالہ چھپا ہوا تھا، جو لوگوں میں تقسیم کیا گیا، انھوں نے اپنا یہ مقالہ کچھ اردو اور کچھ انگریزی میں پڑھا، اس میں یہ دکھایا ہے کہ یورپ کے فضلاء کلام پاک کے غلط سلط ترجمے کرکے کس طرح گمراہی پھیلاتے ہیں، خود یورپ کے بعض اہل نظر نے ان کی مذمت کی ہے، اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

جارج سیل نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ ۱۷۳۴ء میں کیا، اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس سے قبل جو لاطینی زبان میں ترجمے تھے، ان میں اصل سے انحراف تھا، بیلی انڈر نے جو ۱۵۴۳ء میں لاطینی میں ترجمہ کیا اس کو ترجمہ ہی نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں اتنی کثیر غلطیاں ہیں اور اتنی جسارت سے کام لیا گیا ہے اور اتنی چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے یا تبدیلی کی گئی ہے کہ اس کو اصل سے کوئی مطابقت یا مماثلت نہیں ہے ۔ Andrea Arrivabene --- کے لاطینی ترجمہ کے متعلق جارج سیل نے لکھا ہے کہ وہ اور بھی ناقص ہے اور جو ترجمہ Andrew du Ryer نے فرانسیسی زبان میں کیا ہے وہ کسی طرح ترجمہ کہلانے کے لائق نہیں، کیونکہ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار غلطیاں ہیں، جا بجا تحریف یا اضافے ہیں اور آیتوں کو مسخ کیا گیا ہے جو ناقابل معافی ہے، اسی فرانسیسی ترجمہ کو الکزنڈر روس نے انگریزی میں کیا جس کے متعلق جارج سیل کی رائے ہے کہ وہ عربی زبان مطلق نہیں جانتا تھا، اور نہ اس کو فرانسیسی زبان پر عبور تھا، اس نے اصل مترجم کی غلطیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کیا اور بہت ہی مذموم زبان استعمال کر کے ترجمہ کو مضحکہ خیز بنا دیا۔ Father Lewis Marracci نے لاطینی زبان میں ۱۶۹۵ء میں ترجمہ کیا تھا، جس کے متعلق سیل نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ اس تفسیر و ترجمہ میں تمام تر تکرار ہے جس کی وجہ سے ضخامت بڑھ گئی ہے، مگر اتنا ہی غیر اطمینان بخش ہے، کہیں کہیں زبان میں جہالت اور گستاخی سے کام لیا گیا ہے، خود اپنے ترجمہ کے متعلق سیل کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد ان غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو ان ترجموں سے پیدا ہو گئی ہے، اس کا خیال تھا کہ پروٹسٹنٹ کامیابی کے ساتھ قرآن پر حملہ کر سکتے ہیں، اور اس کو بھروسہ ہے کہ قدرت نے پروٹسٹنٹ کا بجا انتخاب کیا ہے کہ وہ قرآن کو شکست فاش دے دیں، اس نے اپنے پیش رو مترجمین اور مستشرقین کی مذمت کی،

جنھوں نے رسول اکرمؐ کی ذات گرامی یا قرآن عظیم پر بے بنیاد الزامات تراشے اور نہایت ہی قابلِ اعتراض زبان استعمال کی، مگر اپنی بے لوث کوشش اور فراخ دلی کے متعلق کہتا ہے کہ "محمدؐ (نعوذ باللہ) کتنے ہی مجرم کیوں نہ ہوں کہ انھوں نے انسانیت پر ایک غلط مذہب تھوپا، مگر ان کی ذات و صفات سے انکار نہیں ہو سکتا ہے، اور میں متقی اور لائق Spankemius کو داد دیتا ہوں کہ ہر چند وہ سمجھتے تھے کہ وہ (یعنی محمدؐ) (نعوذ باللہ) ایک بدقماش جعلساز تھے مگر انھیں بھی تسلیم ہے کہ قدرت نے ان کو یعنی محمدؐ کو تمام کمالات سے متصف کیا تھا، جس میں جسمانی خوبصورتی لطیف زیرکی، اخلاق حمیدہ، غربا پروری، تواضع، حریفوں اور غنیموں کے ساتھ ہمدردی، استقلال، ثابت قدمی، خدا کی حمد و ستائش کرنے والے کی صفت، مکاروں، زانیوں، قاتلوں، حریصوں اور افترا پردازی کے خلاف سختی شامل تھی، ہمت، استقلال، ترحم، شکر، والدین اور بزرگوں کی عزت کے بڑے داعی اور مبلغ تھے، اور ہمہ وقت حمد باری تعالیٰ میں لگے رہتے تھے"

جارج سیل نے خود حضورؐ کی توصیف ان الفاظ میں کی کہ "آپ کی ہوشمندی، عاقلانہ اور کریمانہ برتاؤ اور رویہ جس کے تحت اپنے مشن میں مصروف رہے اس جاہلانہ اعتراض کی تردید کرتے ہیں کہ آپ ایک سخت خود مذہبی پیشوا تھے، سورۂ فاتحہ کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ آپ کے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے تو وہ دیدہ و دانستہ جعلسازی نہیں کرتے تھے، آپ سورۂ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے، لیکن جارج سیل نے اس میں شک ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا، ریورنڈ Wherry نے سیل کے ترجمہ کو اپنی تفسیر کے ساتھ چار جلدوں میں شایع کرایا، اور خود دیباچہ میں یہ انکشاف کیا کہ (نعوذ باللہ) قرآن خود ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ جعلسازی کی پیداوار ہے، اور پیغمبر اسلام کا یہ جھوٹا دعویٰ ہے کہ قرآن سابق کتب الٰہی کی تصدیق کرتا ہے، پادری صاحب نے اپنا مقصد

ان الفاظ میں واضح کیا کہ مسلمانوں میں اس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس کو تسلیم کریں کہ حضرت عیسیٰؑ کی عظیم ہستی کے متعلق تمام انبیاء نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ خداوند قدوس کے فرزند اور گنہگاروں کے نجات دہندہ تھے،

جناب اطہر حسین نے اپنی زبانی تقریر میں یہ فرمایا کہ انھوں نے اپنے مقالہ میں ان تمام مزعومہ الزامات، اعتراضات، بہتان اور مفروضات کی تردید کی ہے، اور آخر میں کہا کہ جارج سیل، وہری، رچرڈ بل، اربری، روڈ بل اور پکتھال نے قرآن کے ترجمے میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کے چند نمونے میں نے اپنے انگریزی کتابچہ میں پیش کیے ہیں، اس وقت انھیں دہرانا ممکن نہیں، پکتھال نے جو غلطیاں کی ہیں وہ عبارت کی ہیں، اور عربی زبان میں قرآن کے اسلوب اور عربی محاوروں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں، اربری کی غلطیاں ترجمہ میں اصل کی طرح موسیقیت اور نغمہ بھرنے کی کوشش کی وجہ سے ہوئیں، اور کچھ عربی محاوروں سے ناواقفیت کی بنیاد پر بھی ہوئیں، اوروں نے دیدہ و دانستہ اور بدنیتی سے فاش غلطیاں کیں

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری پہلے ذکر آچکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ظہران یونیورسٹی (سعودی عرب) کے نمایندہ کی حیثیت سے تشریف لائے تھے، اپنی متانت اور سنجیدگی کی وجہ سے شرکاء کے جاذب توجہ رہے، بولتے تو معلوم ہوتا کہ علم بول رہا ہے، ان کے مقالہ کا عنوان حدیث اور جوزف شاخت تھا، اسٹیج پر آئے تو بولے کہ سب سے پہلے مجھے ایک معذرت پیش کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے یہ مقالہ انگریزی میں لکھا ہے اور انگریزی میں لکھنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ اگر ہم اپنے مباحثہ سے مستشرقین کی اصلاح چاہتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ ہم اپنی آواز اسی زبان میں پہونچائیں، جو ان کے لیے قابل فہم ہو، اس مقالہ کے اصل مخاطب مسلمان نہیں ہیں بلکہ اس کے مخاطب مستشرقین ہیں، یا وہ لوگ ہیں جو ان مستشرقین کے اٹھائے ہوئے سوالات سے

دلچسپی لیتے ہیں، میں معذرت چاہتا ہوں کہ اس کا ترجمہ اردو میں نہیں کر سکا۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے مقالہ کا کچھ حصہ پڑھا، جو افسوس ہے کہ ٹیپ نہیں ہو سکا۔ ان شاء اللہ اس کا اردو ترجمہ معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں شایع ہوگا۔

جناب اوصاف علی جناب اوصاف علی ڈائرکٹر ہمدرد اسلامک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ بڑے جوان ہمت، لائق اور مجمع کو متاثر کرنے والے اہل قلم اور صاحب علم ہیں، دنیا کے ہر گوشہ کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہتے ہیں، ان کا مقالہ بھی ٹیپ نہیں ہو سکا، ان سے مقالہ حاصل بھی نہیں کیا جا سکا ہے، ان شاء اللہ یہ بھی معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں شایع ہوگا،

ڈاکٹر اکمل ایوبی ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری صاحب کے مقالہ کے بعد جناب اکمل ایوبی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے مقالہ "مغربی مستشرقین کے چند بنیادی مقاصد ان کی ترقی کی تاریخ کی روشنی میں" کے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے، سب سے پہلے انھوں نے کہا کہ میں اوصاف صاحب سے یہ کہوں گا کہ مغربی مستشرقین زیادہ تر یہودی ہیں، جن کو اسلام سے گہری دلچسپی ضرور ہے، ان کے انہماک اور علمی تلاش داد کے لائق بھی ہے، وہ دیدہ ریزی اور دقت نظر کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، ان کی کوششوں سے بہت سے علمی نوادرات بھی منظر عام پر آئے ہیں، وہ اخلاق و تصوف کے گہرے سمندر میں مشاق غوطہ خور کی طرح بار بار تیرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، انھوں نے ہمارے قدیم و نایاب علمی شہپاروں کی تلاش و جستجو میں وقت بھی صرف کیا ہے، ان کے متون بھی شایع کیے ہیں، ان کا طرز بیان بھی شستہ اور شگفتہ ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے اہل قلم حضرات کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے متعلق شروع سے کلیسا کے علمبرداروں سے تعصب و تنگ نظری کا جو ورثہ ملا تھا، اس سے وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے، میں نے اپنے مقالہ میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان مستشرقین نے اپنی تحریروں میں کیا کیا مختلف طریقے استعمال کیے، انھوں نے اسلام اور اسلامی معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے

کی خاطر سب سے پہلے ترکوں کو چنا اور ترکی کے قدیم تہذیب وتمدن کو اس طرح پیش کیا کہ بہت سے
ترک دیوں نے اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم کردار
مصطفےٰ کمال اتاترک کا ہے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے صرف اسلام اور اسلامی تہذیب
وتمدن سے ہی نہیں بلکہ اسلامی دنیا سے ہی رشتہ منقطع کرلیا، مغربی مستشرقین کا بنیادی مقصد بھی
یہی تھا، چنانچہ مغرب میں اتاترک کے کارناموں کا زور وشور سے چرچا ہوا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ ترکی میں
ایسا انقلاب آگیا ہے کہ ترکوں نے اسلام سے رشتہ بالکل منقطع کرلیا ہے، اسی اتاترک کو کسی نے
سرفروش مجاہد، کسی نے پرجوش فدائی، کسی نے قابل تقلید سیاست داں، کسی نے قوم کا مصلح اعظم، کسی نے
ملک وملت کا معمار، کسی نے عجوبۂ روزگار، کسی نے آزادی کا عاشق، کسی نے مجاہد اعظم، کسی نے
شمع آزادی کا پروانہ، کسی نے دل ودماغ اور روح سب کو آزاد کرنے والا انسان، کسی نے
عظیم الشان جذبات کا نورانی پیکر کہا، انہی مستشرقین کی کتابیں ہم ہندوستانیوں کی معلومات
کا ماخذ بنیں، اس لیے واقعات کی پوری نوعیت اور صحیح حقیقت پورے طور پر واضح نہیں ہوسکی،
اور نہ عام اور غیر سرکاری ترکوں کا نقطۂ نظر ہمارے سامنے آسکا، غالباً اسی وجہ سے ہندوستان
میں مصطفےٰ کمال سے خوش عقیدگی پائی گئی، اور دینی حلقوں میں بھی ان پر تنقید گوارا نہیں کی گئی،
ان کے سیاسی وقومی خدمات کی وجہ سے ان کے لادینی اقدامات کو بھی نظر انداز کردیا گیا، اس لیے
اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں ایسا علمی وتحقیقی کام ہو جس سے مصطفےٰ کمال کی اصلاحات کے ساتھ
مذہب سے ترکوں کی وفاداری کی تصویر بھی سامنے آجائے، اور وہ فرق بھی ظاہر ہو جو حکومت
کے مختصر اور محدود طبقہ میں اور مسلمان عوام ترک میں آج بھی موجود ہے، ابھی رسالہ "اسلام اور
عصر جدید" کی جلد ۱۴، شمارہ بابت جنوری ۱۹۸۲ء میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے
برنارڈ لوئیس کے مقالہ "اسلام" کا ترجمہ شایع کیا ہے، یہ مقالہ کافی پہلے کا لکھا ہوا ہے، لیکن یہ بہت

کم لوگوں کی نظر سے گذرا ہوگا، اس میں برنارڈ لوئیس نے خود اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں لکھی گئی اسلامی
تہذیب وتمدن سے متعلق زیادہ تر کتابیں ایسے حضرات نے لکھی ہیں جو اصل ماخذ کی زبان سے ناواقف
تھے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یوروپی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں عثمانی حکومت اور اس کے اثرات کو مسخ
کرکے پیش کرتی ہیں، یہ کتابیں خالصۃً مغربی شواہد پر مبنی ہیں، جو زیادہ تر ناقص گھڑی اور غیر معتبر
ہیں، ان میں ترکوں کے رول کی افسوسناک حد تک گمراہ کن تعبیر ملتی ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے
کہ مسلمان اہل قلم اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی اور ادبی تاریخ خود مرتب کریں جو مستند معلومات پر مبنی ہو۔

اس کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے بزرگ عالم جناب قاضی زین العابدین کو مقالہ پیش
کرنے کے لیے دعوت دی، قاضی صاحب کے مقالہ کا عنوان تھا "ہمارے عصری تعلیمی اداروں پر
مستشرقین کے اثرات"۔

جناب قاضی زین العابدین صاحب صدر محترم اور حاضرین کرام! بہت پابندیوں کے ساتھ مجھے
یہاں بیٹھ کر آپ صاحبان سے خطاب کرنا ہے، اور بغیر کسی تمہید کے میں یہ کہوں گا کہ مستشرقین کا تصور
جو ہمارے ذہن میں ہے اس سے وہ تصور مختلف ہوسکتا ہے جو ہمارے دوستوں کے ذہن میں ہے،
میں سمجھتا ہوں کہ استشراق کی تاریخ سولھویں صدی ہجری سے شروع نہیں ہوئی، بلکہ اسپین کے میدانوں
میں مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد عیسائی پادریوں نے اسلام کا مقابلہ شتم رسول سے کیا، وہیں سے
استشراق کی تاریخ شروع ہوجاتی ہے، تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں کس طرح اسپین کے عیسائیوں کو
مسلمانوں کے خلاف صف آرا کیا گیا، انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی بڑی قربانیاں دیں، وہ آتے، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے، آپ کی شان میں گستاخیاں کرتے اور قتل ہوجانا گوارا کرلیتے، پھر شہداء
کا نام پاتے، اسپین کے مسلمانوں کو ختم کرنے کے بعد پھر یورپ میں یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اسے کس طریقہ سے
مسلمانوں سے محفوظ رکھا جائے، اپنی ناقص رائے کے مطابق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں آنجناب کا

بت بنایا گیا، اور بت بھی بہت شنیع قسم کا، کل یہ بحث چل رہی تھی کہ مسلمانوں کا محمڈن اور مسلمانوں کے
کالجوں کا محمڈن کالج وغیرہ نام رکھنے کا رواج کیسے چلا، وہ تو ہمارے رسول ؐ کے اسم مبارک کو بھی
بگاڑنے کی فکر میں لگے رہے، جناب رسول اللہ ؐ کو محماد یا محمت کہا گیا اور آپ ؐ کا عجیب وغریب شنیع
اور نہایت ہی ناپاک قسم کا تصور ذہنوں کے اندر راسخ کیا گیا، اسی لیے انگریز ہندوستان میں آئے تو
انھوں نے اسلام کو محمڈن ریلیجین قرار دیا، اور بہت سے مسلمانوں نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس نام کو
قبول کیا، اب گالی گلوج کا زمانہ نہیں رہا، زمانہ اس کا ہے کہ جوتیوں کو ریشم کے اندر لپیٹ کر پیش کیا جائے،
عمدہ قسم کے شربت کے گلاس میں گندگی ڈالی جائے، مستشرقین نے یورپ میں ادارے قائم کر رکھے ہیں،
اور اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تفسیر وحدیث اور سیرت وغیرہ کی نایاب
کتابوں کے بھی ترجمے کیے، ان کو ایڈٹ کیا، ان کو طبع کرایا، اس سلسلہ میں مسند احمد بن حنبل کی طباعت
پر واقعی سارا عالم اسلام ان کا شکر گذار ہے، یہ واقعی بڑی خدمت ہے، ہمارے مولانا شبلی رحمۃ اللہ
نے تو بہت ہی مبالغہ آمیز طریقہ پر اس کی تعریف کی ہے، اس بیچارے کو مسند احمد بن حنبل کا ایک ایک
لفظ اس لیے دیکھنا پڑا کہ اس کو کتاب چھپوانے میں پروف ریڈنگ خود ہی کرنا تھا، اور علمائے اسلام
اس لیے مطالعہ نہ کر سکے کہ اس وقت تک یہ چھپی نہ تھی، اس کتاب کی طباعت واشاعت سے اس کو
جناب رسول اللہ ؐ کی سیرت یا آپ ؐ کی تعلیمات سے واقف ہونا نہیں تھا، میں ان لوگوں کو برا نہیں
سمجھتا ہوں، ذاتی طور پر یہ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، مجھے کینٹول اسمتھ صاحب سے ملاقات کرنے
کا موقع ملا، اور میری ان سے جو گفتگو ہوئی اس کی ترجمانی پروفیسر محمد مجیب نے کی، بہت اچھے
آدمی ہیں، انھوں نے مجھ کو بتایا کہ عراق، شام اور دوسرے اسلامی ملکوں میں لا الہ الا اللہ کے
ورد کے طریقے کیسے کیسے مختلف انداز کے دیکھے، میں نے اس وقت بھی اور بعد میں اپنے دوستوں سے
کہا کہ کاش یہ ضربیں پروفیسر اسمتھ کے کان سے گذر کر دل تک بھی پہونچتیں، ویسے وہ بہت نیک آدمی ہیں،

میں اپنا مقالہ شروع کرنے والا تھا کہ اس سے پہلے ہی ختم کرنے کا تقاضا کیا گیا، اس لیے میں مقالہ
تو چھوڑے دیتا ہوں، لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ مسند احمد بن حنبل کو ایک مستشرق نے ایڈٹ کیا ہے،
مستشرقین کی نئی نئی کتابیں آرہی ہیں اور بہت خوبصورت آرہی ہیں، اندر کیا ہوتا ہے وہ دیدہ ور
ہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، ہمارے جدید تعلیم یافتہ مسلمان ان کی طرف لپکتے ہیں، اور ان کی صورت
شکل دیکھ کر طبیعت یہ چاہتی ہے کہ ہم بھی ان کا مطالعہ کریں، لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اس
شربت روح افزا کے اندر زہر کے قطرے ملے ہوئے ہیں، اسلامک اسٹڈیز کی طرح جدید اسلامی
ملک کے جو ادارے جگہ جگہ قائم ہو رہے ہیں، افسوس ہے اس میں وہی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں
جو مستشرقین یورپ کی لکھی ہوئی ہیں، ہمارے دوست جو پروفیسر اسمتھ کے شاگرد ہیں، وہ ان کا یقیناً
احترام کریں گے اور ان کو احترام کرنا چاہیے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہماری مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ
اور جامعہ عثمانیہ وغیرہ کے مخلص بانیوں نے تعلیم دینیات کے لیے اسلامی اور دینی ادارے قائم کیے
ان میں سے بعض یونیورسٹیوں میں دینیات کے شعبے ختم کیے جا چکے ہیں اور اسلامک اسٹڈیز کے
ادارے بھی قائم ہوئے ہیں، میں جب جامعہ ملیہ میں تھا تو میں نے بخاری پڑھائی، میں نے وہاں
تفسیر بھی پڑھائی، فقہ کے ساتھ ساتھ حماسہ پڑھائی اور متنبی اور سبعہ معلقہ بھی پڑھایا، لیکن مجھے
افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہاں یہ ڈپارٹمنٹ ہی ختم کر دیا گیا اور اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ قائم
ہے، میں نے ابھی حال ہی میں ایک لکچرر صاحب جناب ماجد علی خاں صاحب کا ایک مضمون پڑھا تو مجھے
بہت افسوس ہوا، مستشرقین نے علوم اسلامیہ کی جو تاریخ لکھی ہے یا جو انھوں نے تنقید کی ہے ان کو ضرور
پڑھیے، مطالعہ کیجیے اور جواب دیجیے، لیکن طلبہ کے ذہن کو جناب رسول اللہ ؐ کے سرچشمہ سے سیراب کرنے
کے لیے ضروری ہے کہ قرآن، حدیث، علم کلام اور فقہ کی اصل کتابیں نصاب میں داخل رہیں، جیسا کہ
علی گڑھ میں ہے کہ شعبہ دینیات بھی ہے، اسلامک اسٹڈیز بھی ہے، اسلامک اسٹڈیز کے شعبے

آپ قائم کر سکتے ہیں، تاریخ فقہ، تاریخ حدیث اور تاریخ قرآن کے پڑھانے سے ہم آپ کو منع نہیں کرتے، لیکن ایسی تاریخیں جو فقہاء، صوفیاء اور محدثین کے کیرکٹر کو مجروح کر دیں اور ان بنیادوں کو ہی گرا دیں جن پر اسلام اور تعلیمات اسلام کی عمارت کھڑی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی غلط ہوگا، میں بلڈ پریشر کا بھی مریض ہوں اور ادھر ادھر سے بھی دباؤ پڑ رہا ہے، میں اپنے ان دوستوں سے جو اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں پڑھا رہے ہیں اور ناواقفیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، معذرت کرتا ہوں، وہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بہت اچھے ہیں، مگر ظاہری اخلاق کے اعتبار سے وہ اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

قاضی صاحب کی اس تقریر کے بعد جامعہ ملیہ کے پروفیسر مشیر الحق صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے، ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے ان سے کہا کہ وہ مختصر طریقہ پر اپنا جواب دیں۔

پروفیسر مشیر الحق پروفیسر مشیر الحق نے کہا کہ شاگردان مستشرقین پر تین دنوں سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس پر تو میں کچھ بھی نہیں کہوں گا، اس لیے کہ شاید اسی طرح ان کے ناکردہ گناہوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہوتی جا رہی ہے، لیکن چونکہ مولانا نے ایک متعین ادارہ کا نام لے کر وہاں کے بارہ میں جو معلومات مہیا کی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کو ان کے بارہ میں پوری طرح صحیح اطلاع نہیں ہے، جامعہ ملیہ میں کبھی بھی دینیات کے نام سے کوئی شعبہ قائم نہیں تھا جس کو ختم کر دینے کا کوئی سوال پیدا ہو، مولانا حماسہ و متنبی اور اسی قسم کی جو کتابیں پڑھاتے رہے ہیں تو وہ چیزیں آج بھی باقی ہیں، فرق اتنا ہوگیا ہے کہ یہ شعبۂ عربی کی چیزیں ہیں، شعبۂ عربی میں پڑھائی جا رہی ہیں، اسلامک اسٹڈیز یا شعبۂ دینیات کے نام سے پہلے جامعہ ملیہ میں کوئی شعبہ نہیں تھا بلکہ ایک سسٹم تھا جس میں یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے، ۱۹۵۲ء سے میں جامعہ سے منسلک ہوں، میں نے وہیں تعلیم حاصل کی اس وقت بھی وہاں کوئی ایسا ڈپارٹمنٹ نہیں تھا، ممکن ہے جس وقت مولانا محمد علی جوہر نے

جامعہ ملیہ قائم کی اس وقت کوئی ایسا شعبہ رہا ہو، جو لوگ ہندوستان میں رہتے ہیں ان کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ عربی دینی مدارس میں جس طرح سے تعلیم ہوتی ہے اور جس پس منظر سے طالب علم آتے ہیں اس میں اور یونیورسٹیوں میں جو طالب علم آتے ہیں ان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

پروفیسر مشیر الحق صاحب کی اس وضاحت کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے شبلی کالج کے ایک نوعمر طالب علم مرزا اصغر بیگ کو اسٹیج پر بلایا، اس کمسن طالب علم کی حوصلہ افزائی کے لیے بولنے کا موقع دیا گیا، اس کمسن بچے نے انگریزی میں بہت صاف اور متین لہجہ میں مستشرقین پر ایک تقریر کی، اس کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے صدر نشین جناب ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق کو صدارتی کلمات کہنے کی زحمت دی۔

ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دارالمصنفین کے کارکنان کا شکریہ ادا کیا، سیمینار کی کامیابی پر مبارکباد دی، انھوں نے کہا اکثر مقالات سے یہ ظاہر ہوا کہ مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے اکثر کی تحریروں میں تعصب اور ان کے جہل اور ناواقفیت کا اظہار ہوتا ہے، مجموعی طور پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستشرقین سے کوئی بہتر توقع نہیں کی جا سکتی اس لیے ان سے خوش گمانی کے کوئی معنی نہیں، قرآن پاک بھی ایسی ہی تعلیم دیتا ہے، خدا تعالیٰ کا قول ہے وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَن تَبِعَ دِينَكُمْ، لہٰذا ہمارے دین کے علاوہ جو دوسرے ادیان کے پابند ہیں، ان کی بات کو کس طرح ہم قابل اعتماد اور قابل وثوق سمجھ سکتے ہیں، قرآن پاک اور تعلیم رسولؐ ہم کو یہ بھی سکھاتی ہے کہ لا یلدغ المؤمن من جحر مرتین، جب ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر آج تک یہ مستشرقین ڈنک مارتے اور ہم کو نقصان پہنچاتے رہے تو پھر ان کے

حسن نیت پر یقین کر لینا اور ان کی طرف سے صفائی پیش کرنا کچھ معنی نہیں رکھتا، دوسری بات یہ ہے کہ مستشرقین میں سے وہ مستشرقین جنھوں نے واقعی صاف دل اور حسن نیت سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو پھر ان کا دل اسلام کی حقانیت سے معمور ہوا، اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے، مستشرقین جب تمہید کے طور پر اسلام کی یا رسول اسلام کی تعریف کرتے ہیں، تو درحقیقت وہ ان کی ایک علمی اور ماہرانہ چال ہوتی ہے، جس کے بعد وہ اپنا اصل مقصد بیان کر کے اپنی منزل مقصود تک پہونچنا چاہتے ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مفصل پروگرام وضع کر کے ضروری تجویزیں پیش کی جائیں، ایک تجویز یہ ہو کہ ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جو مستشرقین کی غلطیوں کی نشان دہی کرے، اور ان کو مرتب کر کے یکجا کرے، تاکہ ان پر غور کیا جا سکے، ایک اور تجویز جو قابل غور ہے وہ یہ کہ اسلامی یونیورسٹیاں اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبے اس بات کا اہتمام کریں کہ ان کے طالب علم مستشرقین کے مراجع پر اعتماد نہ کریں، بلکہ خود مسلمانوں کی کتابوں کو اعتماد کا مقام دیں اور محض ضمنی طور پر مستشرقین کی کتابوں کو استفادہ کے لیے دیکھیں، اس کی بھی ضرورت ہے کہ یونیورسٹیوں کے طلبہ کو یورپ میں ایسی جگہوں پر نہ بھیجا جائے جہاں وہ مستشرقین سے استفادہ پر مجبور ہوں، ایک اہم مسئلہ مستشرقین کے تلامذہ کا ہے، یعنی وہ افراد اور نوجوان جو مستشرقین کے افکار سے زیادہ متاثر ہیں ان لوگوں کے بارے میں عام طور سے بدگمانی مناسب نہیں ہے، کیونکہ ان میں بہت سے ایسے اسکالر ہیں جنھوں نے سفارت کا صحیح حق ادا کیا ہے، اچھی ترجمانی کی ہے، صحیح تعارف کرایا ہے، اپنے مستشرقین اساتذہ کے تعارف میں ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے ان پر تنقید بھی کی ہے، ان حضرات میں ڈاکٹر عبدالکریم، ڈاکٹر مصطفی اعظمی، ڈاکٹر محمد امین مصری اور ڈاکٹر مصطفی سباعی جیسے محققین اور دانشور ہیں، آخری بات یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں جو تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں ایک تجویز پاس ہوئی تھی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مروج موجودہ نصاب تعلیم کو کھنگالا جائے اور ان سے وہ تمام اجزاء نکالے جائیں جو اسلامی علوم و فنون کیلئے زہر کا درجہ رکھتے ہیں، اور نیا نصاب مدون کیا جائے جو ان تمام خدشات سے پاک ہو۔

ادبیات

ایک دوست کے نام

از جناب جگن ناتھ آزاد صاحب، کشمیر

جس نے مجھے میرے موجودہ مشکل دورِ زندگی میں یہ مشورہ دیا ہے کہ میں
اپنے فلاں عزیز کی دعوت پر انگلستان جا کر آباد ہو جاؤں

میں اگر آباد ہو جاؤں دیارِ غیر میں   تم مرا ہمسر، مرا ثانی کہاں سے لاؤ گے
حل کرے اقبالؔ کے جو فکر و فن کی مشکلات   ایسا انساں تم بآسانی کہاں سے لاؤ گے
جس میں اطمینانِ دل بھی ہو سکونِ جاں بھی ہو   اس طرح کی تم پریشانی کہاں سے لاؤ گے
نطق سے جس کے ہوں اسرار و رموزِ علم فاش   ایسا اک مجموعِ نادانی کہاں سے لاؤ گے
ہر گھڑی محوِ سفر ہو جو دیارِ ہند میں   ایسی تصویرِ تن آسانی کہاں سے لاؤ گے
سینہ چاکی ہی رہے جس کا شعارِ زندگی   وہ عدوئے چاک دامانی کہاں سے لاؤ گے
جس نے اپنا سوز بھارت کے مسلماں کو دیا   وہ ادائے کفر سامانی کہاں سے لاؤ گے
شعر جس کا بے مثال و نثر جس کی بے نظیر   اس قلم کی شانِ جولانی کہاں سے لاؤ گے
جس سے اردو کے مخالف راکھ ہو کر رہ گئے   نثر کی وہ شعلہ سامانی کہاں سے لاؤ گے
کارواں اردو کا جس کے دم سے بڑھتا ہی گیا   نظم کی وہ شانِ طوفانی کہاں سے لاؤ گے

دوستو! جوئے رواں میں بہ گیا جو ایک بار
پھر اگر چاہو تو وہ پانی کہاں سے لاؤ گے

مطبوعات جدیدہ

کیمیا کی کہانی :- مرتبہ جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸، قیمت سات روپیے پچاس پیسے، پتہ: ترقی اردو بورڈ نئی دہلی۔

مرکزی حکومت کے قائم کردہ ادارہ ترقی اردو بورڈ نے مختلف علوم، جدید فنون اور بچوں کے ادب و سائنس سے متعلق متعدد کتابیں شایع کی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی مفید کڑی ہے، اس میں بعض عناصر ہوا اور آگ وغیرہ کی دریافت کے بارہ میں چند یورپین سائنسدانوں کے تجربات و انکشافات بیان کیے گئے ہیں، اس سلسلہ میں لے وائسر، ہمفری ڈیوی، رابرٹ بنسن، کرشوف، ہنری کے وینڈش اور مادام کیوری وغیرہ کی غیر معمولی محنت و جانفشانی کی سرگذشت تحریر کی گئی ہے، جو دلچسپ اور سبق آموز ہے، اس کو پڑھ کر جہاں بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا وہاں ان کے اندر اس قسم کی چیزوں کی تحقیق و دریافت کی امنگ بھی پیدا ہوگی، گو یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، مگر جدید علوم سے ناواقف اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کیلئے بھی یہ مفید اور دلچسپ معلومات سے پُر ہے، اس کے لائق مرتب جناب سید شہاب الدین دسنوی وسیع علمی و تعلیمی تجربہ رکھنے کے علاوہ اردو کے اچھے اہل قلم بھی ہیں، وہ انجمن اسلام اور صابو صدیق پالیٹیکنک بمبئی کے کامیاب اور نیک نام پرنسپل کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں، اور انھوں نے بچوں کے کورس کی متعدد مفید کتابیں لکھی ہیں، امید ہے کہ یہ کتاب بھی مقبول ہوگی۔

بہار میں اردو نثر کا ارتقاء (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک) مرتبہ ڈاکٹر سید مظفر اقبال صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات [illegible]، مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]، پتہ: [illegible]

زیر نظر کتاب وہ مقالہ ہے جس پر پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۲ء میں مصنف کو ڈی. لٹ کی ڈگری ملی تھی، اس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کے صوبۂ بہار سے تعلق رکھنے والے اردو مصنفین اور ان کی نثری تصنیفات کا ذکر ہے، یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ۱۸۵۷ء سے پہلے بہار میں اردو نثر کے عہد بعہد ارتقا کا حال بیان ہوا ہے، اس ضمن میں وہاں کے تاریخی و سیاسی حالات اور ہندوستان میں اردو نثر کے آغاز و ارتقا کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے، اور اردو کی پہلی نثری تصنیف پر بھی اظہار خیال کیا ہے، دوسرا باب ان مذہبی تحریکوں کے لیے مخصوص ہے جن کی بدولت ۱۸۵۷ء کے بعد بہار میں اردو نثر کو زیادہ فروغ ہوا، اس سلسلہ میں تحریک اہلحدیث کی مساعی و خدمات کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ ہے کیونکہ بہار اس تحریک کا خاص مرکز تھا۔ لائق مصنف نے اس تحریک کی تائید و حمایت کی طرح اس کی مخالفت میں لکھی جانی والی کتابوں اور ان کے مصنفین کا ذکر بھی کیا ہے، اسی باب میں شیعیت کی تائید و تردید اور عیسائیت، آریہ سماج اور قادیانیت وغیرہ کے جواب پر مشتمل کتابوں کا ذکر بھی ہے، تیسرا باب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقا اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک بہار سے شایع ہونے والے اردو اخبار و رسائل کے متعلق معلومات درج ہیں اور دوسرے حصہ میں تاریخ، تذکرہ، سیر، سوانح، آپ بیتی، سفرنامہ، جغرافیہ، ریاضی، قانون، طب، سائنس، فلسفہ اور تعلیم وغیرہ فنون کی تصانیف اور ان کے مصنفین کا تذکرہ ہے، چوتھے باب میں داستان، تمثیل، ناول، ڈرامہ اور فن تنقید کی کتابوں کا جائزہ لیا ہے، آخری باب میں لغت، انشاء، قواعد، محاورہ اور ضرب الامثال کے متعلق تصانیف کا خاکہ دیا ہے، صوبہ بہار کی اردو نثر کی خدمات پر اس سے پہلے بھی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں، لیکن جس عہد کے نثری کارناموں کا اس کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے اس پر کوئی مستقل کتاب موجود نہیں تھی، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی، لیکن اس طرح کے کاموں میں برابر نئی نئی باتیں دریافت ہوتی رہتی ہیں، اس لئے یہ کتاب مکمل نہیں کہی جاسکتی تاہم اس موضوع پر

کام کرنے والوں کو آیندہ اس سے بڑی مدد ملے گی، یہ کتاب تلاش و محنت سے مرتب کی گئی ہے اور اس سے مصنف کے
علمی و ادبی ذوق، ترتیب و تالیف میں سلیقہ مندی اور نقد و نظر کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے اپنی
تحقیق و جستجو سے متعدد فراموش شدہ کتابوں اور ان کے مصنفین کا نام ضائع ہونے سے بچا لیا، اس کتاب میں ۱۸۵۷ء
سے قبل کے نثری کارناموں کا اجمالی ذکر بھی آگیا ہے اس سلسلہ میں مصنف نے اپنے پیش رو اہل قلم کی کاوشوں کا
خلاصہ پیش کیا ہے اور کہیں کہیں اس پر مفید اضافہ کیا ہے، چوتھے باب میں داستان تمثیل اور ناول کی کتابوں کا مبسوط
تعارف کرایا ہے، مگر دوسری نوعیت کی اہم کتابوں پر اس قدر سیر حاصل بحث نہیں کی ہے، ص ۲۰۱ پر وسیلۂ شرف
و ذریعۂ دولت کا ذکر چند سطروں میں کیا ہے اور ان کے مصنف کے حالات تو درکنار اس کا پورا نام بھی تحریر نہیں
کیا ہے، ان دونوں کتابوں کا چوتھا اڈیشن مصنف کے ہم صوبہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی کی تصحیح و تحشیہ کے بعد ۱۹۶۵ء میں شائع
ہوا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ انکو اسکے ایک ہی اڈیشن کا علم ہے، انھوں نے وسیلۂ شرف کا سنہ تصنیف ۱۳۱۴ھ بتایا ہے
جبکہ خود اسکے آخر میں ۱۳۱۲ھ اور ڈاکٹر محمد طیب نے ۱۳۱۱ھ لکھا ہے، نیز انھوں نے دونوں کے متعلق لکھا ہے "یہ پہلی
مطبع پنچ بانکی پور سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئیں" حالانکہ ڈاکٹر محمد طیب کا بیان ہے کہ انکی پہلی اشاعت مصنف کی
زندگی ہی میں احسن المطابع پٹنہ سے ۱۳۱۳ھ میں ہوئی اور دوسری اشاعت مطبع اخبار پنچ بانکی پور پٹنہ سے
۱۳۲۴ھ میں ہوئی، مشہور اشخاص کے مفصل حالات تحریر کرنے کے بجائے، غیر معروف اشخاص کا مبسوط حال
قلم بند کرنا چاہیے تھا، مصنف کو اعتراف ہے کہ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا زیادہ حصہ رہا ہے مگر انھوں
نے تصوف کی کتابوں کا ذکر کسی مستقل عنوان کے تحت نہیں کیا ہے، ردِ شیعیت کی کتابوں کے آخر میں بلا عنوان فقہی و دینی
کتابوں کا ذکر بے موقع ہے، ص ۹۰ پر ایک کتاب کا نام جلاء العینین مع الدرۃ رکنا النزول فی وضع الیدین علی الصدر و تحت السرہ
لکھ کر اسکا موضوع یہ بتایا ہے "کتاب و سنت کی روشنی میں ترک رفع یدین کو صحیح اور جائز ثابت کیا گیا ہے" گمنام سے ظاہر
ہوتا ہو کہ اس میں نماز میں سینہ کے بجائے ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو صحیح ثابت کیا گیا ہوگا، بعض جگہ "ثقیل" نامانوس بلکہ غیر مناسب الفاظ
لکھے ہیں، مثلاً "ردِ عیسائیت میں چند رسائل لکھے تھے جواب مفقود و الخبر ہیں (ص ۹۴) حسن اتفاق یہ ہے کہ تینوں جس طرح
نصائح میں مشارک ہیں" (ص ۳۴۰) بعض کتابوں کے نام بھی تصحیح طلب ہیں۔

"ض"

جلد ۱۳۰ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۲ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ایک ضروری تصحیح

معارف بابت ماہ جنوری ۱۹۸۲ء کے صفحہ ۶۹ پر قرآن مجید کی آیتوں کی طباعت کی غلطیوں کی تصحیح ناظرین اسطرح کرلیں

سطر	غلط	صحیح
۷ و ۸	عیسی ابن مریم و رسول اللہ	عیسی ابن مریم رسول اللہ
۱۲	یُبَشِّرُكَ	یُبَشِّرُكِ
۱۲ و ۱۳	المسیح بن مریم	المسیح عیسی ابن مریم